فروری 2001

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

اقلیتی تعلیم کا بدلتا ہوا منظر نامہ

مدرسہ جامعۃ الحسن الہ آباد میں قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر تربیتی مرکز کے افتتاح کے موقع پر
مدرسے کا طالبِ علم حافظ محمد ساجد مرکزی وزیر برائے ترقیِ انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کا استقبال کرتے ہوئے

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

مدرسہ جامعہ الحسن الہ آباد میں ڈاکٹر ایم ایم جوشی ہال کا افتتاح 31؍دسمبر 2000ء کو مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے کیا۔
ڈاکٹر جوشی کے ساتھ ہیں مدرسے کے مہتمم جناب قاری محمد احمد۔

اردو جرنلزم اور ماس میڈیا پینل کی میٹنگ قومی اردو کونسل کے دفتر میں 9؍نومبر کو جناب جی ڈی چندن کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تصویر میں (بائیں سے) جناب اسرار سلطان پوری (نئی دہلی)،
پروفیسر نصیر احمد خاں (جے این یو)، ڈاکٹر محمد احسن (آر۔ اے)، ڈاکٹر، محمد حمید اللہ بھٹ، جناب جی ڈی چندن اور ڈاکٹر ایس اے ایس رضوی (پی پی او)۔

ماہنامہ
اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔3، شمارہ 2 : فروری 2001

قیمت-/10روپے سالانہ -/100روپے

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: ارجمند آرا

مشیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ تعلیم۔ حکومت ہند

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 6103938، 6103381
6179657 فیکس: 6108159
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.com
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد
دہلی۔110006

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 6109746

شاخ: 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدر آباد 500 001 (A.P.)
فون: 4615139

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2

ہماری بات .... اداریہ 5

● بچے کو تعلیم کا حق (گیسٹ کالم) .... عظیم پریم جی 6

● ہندستان کی قومی زبان .... ذاکر حسین / معین اعجاز 8

● اردو زبان، تعلیم اور مسلمان: ایک تثلیثِ بے کلیسا .... سید شہاب الدین 12

● اردو میڈیم اسکول: کیفیت، مسائل اور تدابیر .... سید حامد 17

● اڑیسہ میں اردو کی صورت حال .... حفیظ اللہ نیولپوری 20

● اردو رسم خط کی جامعیت .... محمد ایوب خاں 24

● اکیسویں صدی میں اسلامی مدارس۔ تقاضے اور امکانات .... غلام یحییٰ انجم 27

● جدوجہدِ آزادی میں حیدر آبادی مسلمانوں کا حصہ .... جواد رضوی 30

گوشۂ ادب

● شمس الرحمٰن فاروقی سے کچھ باتیں جدیدیت کے حوالے سے .... عارف ہندی، جاوید انور 34

گوشۂ فروغ کتب

● اردو نثر سترھویں صدی میں (تاریخ ادب اردو 1700 تک سے اقتباس) .... سیدہ جعفر 38

● کہکشاں (اردو انسائیکلوپیڈیا جلد سوم سے اقتباس) 43

طلبہ کے لیے

● میڈیکل ٹرانسکرپشن .... امتیاز عالم 46

● بیرونی ممالک میں تعلیم۔ ویزا، اسکالرشپ .... سلمان عابد 48

● کمپیوٹر گپ بازی .... سیدہ سارہ مظہر شطاری 52

● اردو ادب کوئز!! .... فیروز عالم 54

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں (اکتوبر تا دسمبر 2000) .... ادارہ 57

اُردو خبرنامہ .... ادارہ 61

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 71

● کلیات سراج / سراج اورنگ آبادی .... مبصر: سرور الہدیٰ ....

● موازنۂ انیس و دبیر / ڈاکٹر ارشاد نیازی .... مبصر: اظہار احمد ندیم ....

● مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ / ڈاکٹر قمر جہاں .... مبصر: کوثر مظہری ....

● نغمہائے گفتنی / پروفیسر اکبر رحمانی .... مبصر: ابو ظہیر ربانی ....

● جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس / یاسمین کوثر .... مبصر: پرکاش چندر ....

● اُفق کی مسکراہٹ / اسلم جمشید پوری .... مبصر: قمر جہاں ....

● دو دوی دروازے / منیر الدین احمد .... مبصر: وسیم بیگم ....

● صدف اردو پرائمر پارٹ I، II اور III / خوشحال زیدی .... مبصر: ابرار رحمانی ....

بچوں کا گوشہ

● قالین والے کی زبان .... انوار رضوی 77

آپ کی بات

■ **لینا ہنفورڈ**، کیوریٹر ساؤتھ ایشین اسلامک لینگویجز، برٹش لائبریری، لندن۔

میں ''اردو دنیا'' کا مطالعہ بہت دل چسپی سے کرتی ہوں۔ مجھے قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ تک رسائی کا شرف بھی حاصل ہوا ہے جس میں خصوصی طور پر تازہ ترین مطبوعات پر آپ کے تبصرے پڑھنا چاہتی ہوں۔

■ **سید ظفر ہاشمی**، گلبن، F-2، روز اپارٹمنٹس، کوچھرب پلدی، احمد آباد۔380006

آپ کا موقر رسالہ 'اردو دنیا' ہر ماہ پابندی کے ساتھ ملتا ہے جس کے لیے میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں۔ رسالہ انتہائی دلکش اور علمی نیز ادبی نگارشات سے مزین ہوتا ہے۔ دسمبر 2000ء کا شمارہ بھی حسب معمول دیدہ زیب اور معیاری ہے۔ میں اپنی بات خطوط کے کالم سے شروع کرتا ہوں۔ اقبال متین صاحب کی صاف گوئی بہت پسند آئی۔ انھوں نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بھرپور وکالت کی ہے اور بڑی ہمت سے ایسی باتیں کہی ہیں جنھیں اردو کے سیاسی بقراط کہتے ہوئے بہت ڈرتے ہیں۔ پران کپلا نے اپنے خط میں جی۔ ڈی۔ چندن کے کسی مضمون کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے ایک ایسا مشورہ دیا ہے جو اردو رسم خط کو دیوناگری میں بدلنے سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ اُن کا مشورہ ہے کہ اردو کا نام بدل کر ہندستانی کر دیا جائے۔ پران کپلا نے چندن کے خیال کی تائید کی ہے۔ شہروں، ضلعوں اور صوبوں کا نام بدلنا تو ہمارے یہاں ایک طرح کا قومی مزاج بن گیا ہے۔ چندن نے جانے کیوں اردو کا نام ہی بدل دینے کی ایسی تجویز پیش کر دی جس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ جب وہ اور ان جیسے اردو دوست ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تو ہندی کا نام بدل کر اردو یا ہندستانی رکھنے کی تجویز کیوں نہیں پیش کرتے؟ اردو کا نام بدل کر ہندستانی رکھنے کا مقصد وہی ہے جو اردو کو دیوناگری لپی میں لکھنے کا ہے یعنی اردو کو ختم کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش۔ اردو صرف ہندستان کی زبان نہیں ہے۔ یہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ پوری دنیا میں اس کا چلن ہے۔ پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک عالمی زبان کو کسی ملک میں قید کرکے اس کا قتل کرے اور یہ کتنی احمقانہ بات ہوگی کہ اردو کا نام ہندستان میں 'ہندستانی' ہو اور باقی دنیا میں اردو— دراصل ہمارے ملک میں اردو کی بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اسے محبوبہ بنانے کے لیے اور اس سے مزہ لینے کے لیے ہر کوئی تیار ہے لیکن اسے بیوی کا درجہ صرف وہی دے گا جسے وہ سچ مچ عزیز ہے۔

سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نوٹ شائع کرکے آپ نے اردو والوں کے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ ان کے خیالات کتنے ہی حسین پاکیزہ اور سیکولر کیوں نہ ہوں اردو زبان کے حوالے سے ان کا عمل سب کو معلوم ہے کہ 'ہندستانی' کی جگہ ہندی اپنی موجودہ اسکرپٹ میں ملک کی قومی زبان کس کے ووٹ سے بنی تھی۔ (1)

■ **فیروز بخت احمد**، A-202، ادیبہ مارکیٹ واپارٹمنٹس، مین روڈ، ذاکر نگر۔ نئی دہلی۔

اسلام نے مرد اور عورت دونوں پر تعلیم لازم کی ہے مگر تعلیم نسواں کے ساتھ کئی مسائل بھی ہیں۔ مسلم فرقے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ تعلیم کے حصول کے بعد لڑکیاں خود سر ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف یہ خیال بھی ہے کہ موجودہ دور میں مسلم بچیوں کو تعلیم سے دور رکھنے کا مطلب ہے کہ آنے والی نسلیں ماں کی کم تعلیم یا تعلیم سے بالکل نابلد ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ جائیں گی۔ مسلم معاشرے میں ایسا بھی سوچا جاتا ہے کہ اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد لڑکیوں کی شادی مشکل سے ہو پاتی ہے کیونکہ انھیں اپنے پائے کے لڑکے نہیں مل پاتے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم اپنی بچیوں کو تعلیم و تربیت سے ناآشنا رکھیں گے تو کل جب ماں کے روپ میں وہ سامنے آئیں گی تو گود میں پلنے والے کو وہ کیا سبق دیں گی جب کہ بچے کے لیے پہلا اور موثر سبق ماں کی گود کا ہی سبق ہوتا ہے۔

ہندستان کے علمائے دین نے تعلیم نسواں کے بارے میں کئی فتوے جاری کیے ہیں: علمائے دیوبند گنگوہ اور سہارنپور کے بعض علما کی رائے تھی کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ عورتوں کو پڑھنا سکھا دیا جائے لیکن ان کو لکھنا سکھانا موجب فساد ہوگا۔ پڑھنا سکھانے کی حدود یہ تھیں کہ ان کو قرآن شریف پڑھنا اور شرعی مسائل کے متعلق ابتدائی کتابیں پڑھنا آجائے۔

(1) یہ بات اب تحقیق ہو چکی ہے کہ ہندی کو ملک کی سرکاری زبان کا درجہ اکثریتی رائے سے حاصل ہوا، ڈاکٹر راجندر پرشاد کے کاسٹنگ ووٹ سے نہیں۔ (ادارہ)

عورت کے لیے خانگی اُمور کی اہمیت زیادہ ہے اور پردہ بھی ضروری ہے۔

دوسری طرف جدیدیت کے علمبردار لوگ پردے کو تعلیم وترقی کے راستے کی رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلم خواتین میں اپنے گھر کی چہار دیواری میں رہنے سے جو نظم وضبط اور شوہر اور بچّوں کی خدمت کا جذبہ ہے، وہ ختم ہو جائے۔ اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر ہے

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

مگر موجودہ دور کے تقاضوں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ تعلیم کی افادیت سے کسی حالت میں بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اعلا تعلیم یافتہ خاتون گھر میں رہ کر جس طرح سے بچّوں کی پرورش کر سکتی ہے وہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ اگر عورت سروس نہیں کر رہی، کما نہیں رہی تو بھی عورت کی بہترین کمائی شوہر، بچّوں اور رشتہ داروں کے تئیں اس کی خدمات ہیں۔

■ ڈاکٹر محمود شیخ، جبل پور

آپ کے ادارے سے نہایت عمدہ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ بلکہ مفید کتابیں کہنا زیادہ مناسب ہے۔ آپ اگر کانٹ، ہیگل، نطشے، اور دیگر جدید فلسفیوں کی کتابیں، ترجمہ کرائیں اور شائع کریں تو اردو داں حلقے کو بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ مسلمانوں کی پسماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھیں جدید ادبی فلسفے کی شدبد نہیں ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے Republic کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو آج کل دستیاب نہیں ہے۔ علی سردار جعفری نے کبیر پر ایک نہایت عمدہ کتاب شائع کی تھی وہ بھی آؤٹ آف پرنٹ ہے۔ بھرتری ہری کی 'ویراگ شتک، ارسطو کی پولیٹکس (Politics) وغیرہ۔ فرائڈ، G.Jung وغیرہ کا ترجمہ گو کہ مشکل ہے مگر ضروری بھی۔ امید کہ آپ اس طرف غور فرمائیں گے۔ (1)

■ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، ادب کدہ، مہاراج پور، انوار گنج، اعظم گڑھ۔ یوپی

اردو دنیا کا تازہ شمارہ ملا۔ اس شاندار علمی اور معلوماتی رسالے نے اردو کی ادبی صحافت کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ ہے اور اس کا مطالعہ ہر شخص کے لیے معلومات افزا ہے۔

آپ اردو کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں اس کی عام پذیرائی ہونی چاہیے۔ اور ہو بھی رہی ہے۔

■ محمد شمس الحق، صدر 'سلسلہ خانقاہ منیریہ قمریہ، ہتن گھاٹ، پٹنہ سٹی۔

ہم تمام انسانوں، دیگر جانداروں اور جملہ کائنات کا خالق کس قدر مہربان ہے کہ اس نے ہمارے لیے مختلف اقسام کی دولت، بحر و بر میں براعظموں اور جزیروں میں اور نباتات میں پھیلا دی ہے۔ ہم ان قدرتی خزانوں کو بانٹ کر استعمال کرتے ہیں۔ ہم اپنے ماحول اور اُس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے خود کو الگ نہیں کر سکتے۔ ماحول ہوا، پانی، مٹی، نباتات اور حیوانات کے مشترکہ اثرات کا نام ہے۔ ماحول کی آلودگی سے مُراد ہے ان عناصر کے مثبت اثرات کا کم ہونا۔ یہ تمام عناصر از خود کئی عناصر کے مرکب ہیں۔ مٹی، پانی اور ہوا کی آلودگی کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے اندر لازمی اور فائدہ مند اجزا کم ہوتے جا رہے ہیں اور وہ اپنے مثبت اثرات کی بجائے منفی اثرات ڈال رہے ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی، انفرادی، فرقہ وارانہ، ریاستی یا ملکی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ عالمگیر غور وفکر کا عنوان ہے۔ اللہ کی بخشی ہوئی بے شمار دولتوں (Natural Wealth) میں برابر کا حصہ دار ہونے کی وجہ سے ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ماحول کو آلودہ ہونے سے بچائیں اور وسائلِ قدرت (Natural Resources) کے دانشمندانہ استعمال کے لیے جو مثبت کوششیں ہو سکیں، اُن کو عمل میں لائیں اور تمام لوگوں کو بیدار کریں۔ جب ہم سب قدرتی دولت سے یکساں استفادہ کرتے ہیں تو لازمی ہے کہ ہم اس کی حفاظت میں بھی حصہ لیں۔

تو آیئے

☆ زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں۔
☆ محض شوق اور تفریح کے لیے پرندوں اور چوپایوں کا خون نہ بہائیں۔
☆ پانی کے ذخیروں کو آلودہ ہونے سے بچائیں۔
☆ پٹرولیم، کوئلہ اور دیگر ایندھنوں کو زیادہ خرچ نہ کریں۔ ان کا متبادل تلاش کریں۔
☆ لاؤڈ اسپیکر کا بائیکاٹ کریں۔
☆ پلاسٹک اور پولیتھین تھیلیوں کو ادھر اُدھر نالیوں گلیوں اور کوڑا کے ڈھیروں پر نہ پھینکیں۔

■ قاسم زبیری، جنرل سکریٹری، اردو کونسل، پمپری، چنچوڑ

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ ہمدست ہوا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی افادیت کے پیشِ نظر آپ نے اردو بولنے والی اقلیت میں میڈیم لیول پروفیشنلز تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اس کو ہم سلام کرتے ہیں۔ اس طرح

(1) قدیم وجدید سماجی اور سیاسی فلسفیانہ تصورات پر کونسل نے کئی کتابیں شائع کی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ادارہ

انفارمیشن ٹیکنالوجی کا چیلنج اور Dot.com کا سیلاب، اردو میں CDs کی تیاری کے امکانات، اردو عوام کو ملک کی excellence سے جوڑنے کے لیے کوشاں، اس کے علاوہ ریجنل تاریخ پر کام کرنے والے محققین کے لیے National Repository of primery soureses کی حیثیت سے کام، اردو دنیا کے لیے نور کی ایک روشن مشعل کی طرح کوششوں کا ثمر ہے۔ آپ نے اردو ایجنڈے کو قومی ایجنڈے کا حصہ بنادیا ہے قومی اردو کونسل کو اردو زبان کی ترویج وترقی اور اقلیتوں کے تعلیمی مسائل کے بارے میں ایک اہم ڈسکشن فورم (Discussion Forum) ثابت کردیا ہے۔ اس کا اہم تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہوئے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

■ **شبیر اصغر**، N.A.R.62، کوویز گھاٹ روڈ، شبپور، ہاوڑہ

"اردو دنیا" مجھ جیسے ہزاروں نوجوانوں کی پہلی پسند بن گیا ہے کیونکہ ضرورت کی بہت ساری چیزیں یہاں موجود ہیں پھر بھی ایک گزارش ہے کہ حالات حاضرہ پر مبنی کوئیز کا ایک صفحہ اور اہم عالمی خبر نامے پر ایک صفحے کا اضافہ کردیں تو نوجوانوں کے لیے نہایت اہم اور مفید کام ہوں گے۔

■ **محمد توفیق خاں**، تکیہ۔ سرونج۔ (ایم پی)

"اردو دنیا" نے بہت جلد ادبی دنیا میں اپنا الگ مقام بنالیا ہے ردو زبان اور ادب سے متعلق تمام معلومات کے ساتھ ساتھ تبصرے، مضامین، مکتوبات کا حصہ بھی خوب ہے۔ خاص طور پر تبصرے بہت اچھے شائع کیے جارہے ہیں۔

■ **مرزا تحسین عباس**، ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول، جعفر آباد، دہلی۔ 110053

اردو زبان کا ارتقا کیسے ہوا، یہ زبان کن زبانوں سے مل کر بنی، یہاں سے آئی، کیسے آئی؟ یہ ایک مفصل بحث ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کا مزاج سب سے جدا ہے۔ اس میں جو شیرینی گھلی ہوئی ہے وہ کسی بھی زبان میں نہیں ملتی۔ انگلش زبان کو صرف اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ وہ کاروباری زبان ہے۔ اگر آج سے پچاس سال پہلے کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اردو کا استعمال کتنی کثرت سے ہوتا تھا۔ عدالتوں میں، دفتروں میں، کسی بھی کاروبار میں اگر کسی زبان استعمال ہوتا تھا تو وہ تھی اردو زبان۔ اردو آج بھی لوگوں کی پسندیدہ زبان ہے اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر کوئی اردو فلم آتی ہے تو اُسے ہر طبقے کا ردبڑے شوق سے دیکھتا ہے بشرطیکہ اس کو فلموں کا شوق ہو۔ کچھ لوگوں نے اردو کو ایک خاص طبقے کی زبان قرار دے کر اسے محدود کرنے کی کوشش کی ہے اور کررہے ہیں۔ لیکن اردو نئی نسل کی خاص پسندیدہ زبان بنتی جارہی ہے اور شاعری نے اس میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اردو کی شمع کو بجھانے کے لیے کئی آندھیاں آئیں مگر کسی نہ کسی نے فانوس بن کر اس شمع کو بجھنے سے بچالیا۔ آج کے تناظر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کو بڑھاوا دینے کے لیے اردو کمپیوٹر سینٹرز قائم کیے، ان سینٹرز میں داخلے کے لیے انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو سافٹ ویئر کی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری ہے، جس سے اردو کے چلن کو یقیناً بڑھاوا ملے گا۔

■ **محمد محمود رضا**، معلم کمپیوٹر سینٹر، مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ۔ 17

"اردو دنیا" ملا۔ اس رسالے میں اردو زبان اور کمپیوٹر کے متعلق نئی نئی معلومات خوبصورت پیرائے میں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ کمپیوٹر کیلی گرافی کے طالب علم کی حیثیت سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ NCPUL کی طرف سے چلایا جانے والا کورس یک سالہ نہیں بلکہ ششماہی ہونا چاہیے اور بقیہ چھے مہینے میں کوئی بھی ایڈوانس کورس سکھانے کا انتظام ہونا چاہیے تاکہ یہاں سے فارغ طالبِ علموں کو پھر بعد میں کسی دوسرے انسٹی ٹیوٹ کے سہارے کی ضرورت نہ پڑے۔ کمپیوٹر میں روز بروز نئے نئے Package سامنے آرہے ہیں اور ہمیں اس بدلتی ہوئی دنیا سے ہم آہنگ ہونے کے لیے سازگار موقع نہیں مل پارہا ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم مقابلے کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں۔

■ **مسعود انور**، لکھنؤ

اتر پردیش اردو اکادمی کمپیوٹر سینٹر، لکھنؤ کی طرف سے آپ کو عید کی بہت بہت مبارکباد اور آپ کو آنے والا سال بہت بہت مبارک ہو۔ خدا کرے کہ آنے والے سال میں آپ کی سبھی مرادیں پوری ہوں، اور جس نیکی اور کامیابی سے آپ اتنا بڑا Project چلا رہے ہیں، اس کا صدقہ تاعمر آپ کو ملتا رہے۔

یہ Project اپنے آپ میں ایک مثال ہے اور یہ Project ہمارے نوجوانوں کو ایک اچھے مقام تک پہنچانے میں بہت معاون ثابت ہورہا ہے، اللہ آپ جیسا جذبہ سبھی لوگوں کو دے۔ آمین۔

■ **امتیاز عالم**، B-60، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیس 1، نئی دہلی۔ 20

آپ کا معروف ماہنامہ پابندی سے اردو میں علمی اور فکری مباحث شائع کررہا ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ مختلف جدید علوم کو آپ کن خوبیوں سے اردو زبان دینے میں کامیاب ہورہے ہیں۔ اردو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری جدوجہد بھی کچھ اسی سمت میں ہے۔ اردو دنیا کو بدلتے حالات اور تقاضوں سے واقف کرانا ایک ناگزیر ذمے داری ہوگئی ہے۔

ہماری بات

جنگ آزادی کے ہمارے رہنماؤں نے ہندستان کے لیے جمہوری وفاقی ڈھانچے کا جو ماڈل پیش کیا وہ ان کی اس بصیرت اور دور اندیشی کا آئینہ دار ہے جو ہندستان کی گذشتہ تین ہزار سالہ تہذیبی وسیاسی تاریخ کے تسلسل میں اندرونی اور بیرونی تہذیبوں کے متنوع اور ہمہ گیر اثرات سے نمو پذیر ہوئی۔ ہندستان کا مجموعی تشخص جن خصوصیات سے عبارت ہے ان میں فرقے وارانہ آہنگی، مذہبی رواداری اور دوسری تہذیبوں کے مثبت اثرات کو اس طرح قبول کر لینے کا رجحان کہ ان میں غیریت باقی نہ رہے، بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھی عوامل نے ہندستانی تشخص کے ان سماجی رویوں کو جنم دیا جن کے سبب ہم آج یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان کی عظمتوں کو قومیت کے یک لسانی، یک نسلی اور یک علاقائی تصور میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ ہندستان ان سب سے ارفع ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسی بہتی رو کا نام ہے جس نے اپنے تسلسل میں مختلف تمدنی عناصر کو متحدہ سیاسی وجود کے احساس کے ساتھ باندھ دیا۔ چنانچہ سیاسی اتحاد کا یہ احساس قرونِ اولا میں اشوک مہان تو قرونِ وسطا میں اکبر اعظم کے عزائم میں نمایاں ہے۔ عہد حاضر میں اس احساس کی نمائندگی جدید بھارت کے معماروں نے آئین سازی کے ذریعے عظیم تر ہندستانی تشخص کے اظہار کے لیے جمہوری وفاقی نظام کو اختیار کر کے کی ہے۔ جن لوگوں کو ہندستان کے اس وسیع تر تشخص کا احساس نہیں تھا انھوں نے عدم رواداری اختیار کرتے ہوئے علاحدگی اختیار کی اور انتشار اور بے سمتی کا شکار ہوئے۔ آزاد ہندستان جن روایات کا امین بنا وہ اتنی طاقت ور اور ہمہ گیر تھیں، اور وسیع تر تشخص کا حصہ ہونے کا احساس اتنا گہرا تھا کہ عدم رواداری اور تہذیبی انتہا پسندی کے رویوں کو غالب آنے کا موقع کبھی نہ ملا اور رفتہ رفتہ ہندستان کا جمہوری نظام مستحکم اور جمہوری روایت وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ جنسی مساوات، قومی دولت کی متناسب تقسیم، علاقائی، سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ طبقات اور اقلیتوں کو خصوصی مراعات ہندستان کی ہر سیاسی جماعت کے ایجنڈے کے بنیادی نکات میں شامل ہیں۔ یہی آئینِ ہند کے بنیادی مضمرات بھی ہیں۔

اس اعتبار سے موجودہ حکومتِ ہند نے اقلیتوں کو ملکی اور قومی زندگی میں مساوی حقوق دینے اور عہدِ حاضر کی جدید تر سوغاتوں سے بہرہ مند کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے وہ بڑی مثبت اور خوش آئند ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ کسی بھی اقلیتی طبقے کے کسی فرد کو بے جا اندیشوں میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندستان کا جمہوری طرزِ زندگی ایک ایسے منضبط عمل کے روپ میں مستحکم ہو چکا ہے کہ کبھی کبھار رونما ہونے والے معمولی قسم کے aberrations اس عمل میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتے۔

حال ہی میں الہ آباد میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ترقی انسانی وسائل کے مرکزی وزیر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے اقلیتوں کے حوالے سے جو باتیں کہیں وہ مندرجہ بالا پس منظر میں غور طلب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کی حکومت اقلیتوں کو ووٹ بنک کے طور پر نہیں دیکھتی اور نہ ان کے وقار کو مجروح کرنا چاہتی ہے۔ اقلیتیں بھی جدید عصری تقاضوں سے مطابقت پیدا کریں اور نئے زمانے کی سوغاتوں میں ان کی بھی حصے داری ہو، یہ ان کی حکومت کی پالیسی ہے۔ پورے معاشرے خصوصاً اقلیتوں تک نئی تعلیم کی رسائی ہو تبھی ہندستان کی حقیقی ترقی ممکن ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مدرسوں میں نئے علوم کی رسائی ضروری ہے کیونکہ پس ماندہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اپنے بچوں کو مدرسوں میں پڑھنے بھیجتا ہے۔ ان بچوں کو بھی عصری علوم حاصل کرنے اور بہتر معیارِ زندگی حاصل کرنے کا حق ہے۔ یوں مدرسوں کی تعلیمی معاونت اور خصوصاً انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تعلیم کی فراہمی ضروری ہے۔ حکومتِ ہند نے اس پالیسی کا اعادہ بروقت کیا ہے۔ فروغِ اردو کی پالیسیوں کے نفاذ کے لیے حکومتِ ہند کے ذمے دار ادارے کے طور پر قومی اردو کونسل نے ان آئینی اور جمہوری تحفظات کے نفاذ کے لیے گذشتہ چند برسوں میں جو کوششیں کی ہیں ان سے اردو دنیا واقف ہے۔ اردو زبان اور اردو معاشرے کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ان کوششوں کو اردو والوں کا تعاون اور حکومتِ ہند کی بھرپور تائید حاصل ہے جو قومی تعمیر اور قومی مقاصد کے حصول کے لیے ایک نیک فال ہے۔

محمد حمید اللہ بھٹ

عظیم پریم جی

گیسٹ کالم

بچّے کو تعلیم کا حق

ہمارے آئین سازوں نے 1950ء ہی میں دستور میں یہ صراحت کردی تھی کہ 14 سال تک کے ہر بچّے کو 1960ء تک تعلیم یافتہ بنادیا جائے گا۔ اس کے بعد سے اب تک ہر حکومت اس مدّت میں دس دس برس کی توسیع کرتی رہی ہے۔ 1993ء میں سپریم کورٹ نے ایک بے حد اہم فیصلے (مسٹر اُنّی کرشنن کیس) میں کہا کہ ابتدائی تعلیم (14 سال کی عمر تک) ہر بچّے کا بنیادی حق ہے۔ اس فیصلے کو بھی حالانکہ کئی برس گزر چکے ہیں تاہم اس بنیادی حق کو آئینی ترمیم کے ذریعے دستورِ ہند میں شامل کرنا ابھی معرضِ التوا میں ہی ہے۔

آج ہماری آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ ناخواندہ ہے اور اسکول کی عمر کے تقریباً آدھے بچّے ابھی بھی اسکول جانے سے محروم ہیں۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ ہمارے تقریباً دس کروڑ بچّے مزدور کے طور پر کام کرتے ہیں۔ دوسری طرف، گذشتہ پانچ برسوں میں ہندستان اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی صنعت میں عموماً اور عالمی سافٹ ویئر سروسز میں خصوصاً ایک سُپر پاور کے طور پر نمایاں ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال انسانی دائرۂ خیال سے پرے ہے کہ ایک طرف تو ہم عالمی بازار میں ایسا نمایاں مقام حاصل کرلیں مگر دوسری طرف اپنے حالات میں اتنی بھی ہم آہنگی پیدا نہ کرسکیں کہ سبھی بچّوں کو بنیادی تعلیم مل جائے۔ بنیادی تعلیم کی سب کو فراہمی وقت کی سب سے اہم ضرورت اس لیے بھی ہے کہ بہت سے اکادمک مطالعات سے بات ثابت ہوچکی ہے کہ بنیادی تعلیم بہت سے سماجی اور معاشی مظاہر پر سیدھے اور مثبت انداز میں اثر انداز ہوتی ہے، مثلاً آبادی کا استحکام، صحتِ عامہ اور حفظانِ صحت، سماجی امن واماں، روزگار، پیداوار، مجموعی آمدنی (GDP)، اقتصادی ترقی اور ہر شہری کے لیے ایسے مواقع کی فراہمی جس سے ملک میں حقیقی جمہوریت کا قیام ہوسکے۔

بنیادی تعلیم کی فراہمی بچہ مزدوری کے مسئلے کا ایک موثر حل بھی پیش کرتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین ہے اس لیے اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اسکولوں میں لڑکیوں کے داخلہ لینے اور پھر پڑھائی جاری رکھنے کا تناسب لڑکوں کے مقابلے بے حد کم ہے۔ جن مضافاتی تعلیمی کیمپوں کا میں نے دورہ کیا ہے ان میں سے ایک میں ایک لڑکی کی روداد سن کر میں خود بے حد متاثر ہوا کہ کس طرح گیارہ سال کی عمر میں اس لڑکی کی شادی کردی گئی تھی لیکن اپنی بقا کی جنگ اس نے پوری جانبازی سے لڑی اور رضاکاروں کی مدد سے اس کی رسائی تعلیمی کیمپ تک ہوئی۔ اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کیا ہمارے ملک میں ہزاروں لڑکیوں کی یہی کہانی نہیں ہے؟

غریبی کے سبب بچّوں کو اسکول نہیں بھیجا جاتا، یہ بات سراسر مفروضہ ہے۔ میں دیہاتوں میں درجنوں ایسے والدین سے ملا ہوں جو غریبی کے باوجود اپنے بچّوں کو اسکول بھیجنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اپنی سطح پر وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔

تعلیم کی توسیع میں جو مراحل سامنے آتے ہیں ان میں بچّوں کے اسکول میں داخلے سے لے کر ان کا متواتر پڑھائی جاری رکھنا اور تسلی بخش تعلیم حاصل کرنا تک، سب شامل ہیں۔ ان مراحل میں اسکولوں کی قلّت، اساتذہ کی کمی، بچّوں کے تئیں لاپرواہی کا رویّہ اور اساتذہ کی تربیت کا فقدان، اس راہ کے کوہِ گراں ہیں۔

ان مختلف النوع مسائل پر قابو پانے کے لیے ابتدا بچّوں کے والدین کو، خصوصاً ایسے والدین کو جو خود کبھی اسکول نہیں گئے، اس بات پر آمادہ کرنا از حد ضروری ہے کہ بچّوں کو اسکول بھیجنا ایک بالکل فطری امر ہے۔ یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ سانس لینا۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ میں اس بات میں پورا یقین رکھتا ہوں کہ ہر بچّے کے والدین اس کے روشن مستقبل کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور اگر اسکول جانے کا عمل روشن مستقبل کا ضامن بن جائے تو پھر وہ اپنے بچّے کو اسکول بھیجنے سے ذرا بھی نہ ہچکچائیں گے۔ گذشتہ کچھ دنوں سے موجودہ نصاب کی نوعیت پر پُرزور بحث جاری ہے اور یہ اہم مسئلہ قابلِ غور ہے کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد بچّہ کیا کرے۔ ان مباحث کی اپنی افادیت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم پڑھے لکھے ماں باپ، اپنے بچّوں کو اسکول بھیجتے وقت ان مباحث میں کبھی نہیں پڑتے۔ ہم کسی سے نہیں پوچھتے کہ دسویں یا بارھویں کلاس پاس کرنے کے بعد بچّہ کیا کرے گا۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے فطری بات یہ ہوتی ہے کہ بچّہ اسکول جائے۔ اس لیے یہ

● مصنف مشہور کمپیوٹر سافٹ کمپنی "وپرو کارپوریشن" کے چیئرمین ہیں۔

امر بہر حال سب سے اہم ہے کہ ہم دوسرے درجے کے مسائل کو دوسری سطح پر اور بنیادی مسائل کو اولیں ترجیحات میں شامل کریں، یعنی بچے کے اسکول میں داخلے کو اولیں ضرورت کے طور پر یقینی بنائیں۔

اس سے بھی بڑا مسئلہ بچے کی تعلیم جاری رکھنے میں سامنے آنے والی رکاوٹوں کا ہے۔ خصوصاً تعلیم جاری رکھنے اور سیکھنے کے عمل میں طالب علم کی سرگرم حصے داری بے حد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اساتذہ اور والدین دونوں ہی کی ذمے داریاں مساوی ہیں۔ استاد کا کام یہ ہے کہ وہ اس طرح سے بچوں کو پڑھائے کہ تعلیم میں ان کی دلچسپی پیدا ہو اور کم ذہین بچوں میں سیکھنے کے عمل کو مہمیز کرنے کے لیے وہ مسلسل کوشاں رہے۔ اس عمر میں جب بچہ بہت جلد دوسروں کے اثرات قبول کر لیتا ہے، وہ اپنے استاد ہی کو اپنے رول ماڈل کے طور پر دیکھتا ہے۔ بچوں کو ڈانٹنا پھٹکارنا، غیر دل چسپ انداز میں پڑھانا، سیکھنے کی ترغیب نہ دلانا، بے وجہ ان کو اسکول سے باہر بھیج دینا وغیرہ ایسے غیر ذمے دارانہ رویے ہیں جن کے سبب تعلیم کا اصل مقصد فوت ہوتا نظر آتا ہے۔ دوسری جانب بچوں کے والدین کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ وہ بچوں سے یہ معلوم کرتے رہیں کہ انھیں آج کل کیا کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اساتذہ سے ملیں اور تعلیمی عمل میں دلچسپی ظاہر کریں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ تعلیم میں Performance کے پیمانے قائم کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ ان ضوابط پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ جب کوئی فرقہ پورے جوش و خروش سے تعلیمی عمل میں حصہ لیتا ہے تو اس سے بچوں اور ان کے اساتذہ کے حوصلے میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا ہے۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی حصے داری تعلیم کی توسیع کا سب سے اہم وسیلہ بن سکتی ہے۔

سبھی کو تعلیم ملے، اس کے لیے اہم ترین ضرورت حکومتی سطح پر سیاسی قوت ارادی، اس کے نفاذ میں سماج کے سبھی فرقوں کی لازمی شرکت، موجودہ اقتصادی سرچشموں کا مناسب استعمال، اضافی اقتصادی سرچشموں کی تلاش اور ضرورت کے مطابق نئے اور خلاقانہ رویے اپنانے اور نتائج کے جلد از جلد حصول کے لیے کوشاں رہنے کا رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ حکومت نے 2010ء تک تعلیم کو عام کرنے کا عہد کیا ہے اور اس میں بھی زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہماری مرکزی حکومت اور کچھ ریاستوں کے رہنماؤں کی کوشش یہ ہے کہ وہ اس نصب العین کو وقت سے پہلے حاصل کر لیں۔ اور یہ کہ بہت سے کارپوریٹ اور رضاکار ادارے نیز انفرادی طور پر لوگ اس مقصد کے حصول میں پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا دست تعاون پیش کر رہے ہیں۔

ہمارے لیے یہ لازم ہے کہ ہم اس بات کو یقینی بنائیں کہ ملک کا ہر بچہ نہ صرف اسکول جائے بلکہ وہ وہاں علم بھی حاصل کرے۔ اس صورت حال کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا، اگر ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہمیں خواندگی کی تعریف بدلنی ہوگی اور ہر بچے کے لیے دسویں کلاس تک تعلیم کو لازمی قرار دینے کے علاوہ انفارمیشن ٹیکنالوجی خواندگی کو بھی لازمی قرار دینا ہوگا۔ بچوں میں سیکھنے اور حاصل کرنے کی لامحدود صلاحیتیں مخفی ہوتی ہیں، ضرورت صرف ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے مناسب موقع کی ہوتی ہے۔ یہ صلاحیتیں کچھ اس طرح اجاگر ہوں کہ بچہ بچہ بھی رہے اور علم بھی حاصل کرے، کیونکہ تعلیم اور بچپن دونوں ہی پر اُس کا پورا پورا حق ہے۔

(ٹائمز آف انڈیا، 9/دسمبر 2000ء، ترجمہ: ارجمند آرا)

انتخابِ غزلیاتِ میر

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

میر تقی میر کی شاعری کا منظر نامہ شخصی زندگی کی حدوں کو سمیٹتا ہوا ایک آفاقی انسانی صورت حال کو ابھارتا ہے جس میں سایوں اور روشنیوں کی ایک طلسمی دنیا آباد ہے۔

دوسری اشاعت

255 صفحات — قیمت: 62/روپے

انسانی شخصیت کے اسرار و رموز

پروفیسر ساجدہ زیدی

علم النفسیات کا سب سے اہم پہلو شخصیت کی نفسیات ہے۔ اس کتاب میں انسانی شخصیت کے کردار، تحرک، جبلتی، فعلی اور امکانی عناصر اور ان کی نمو پذیر شخصیت کی پردہ کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی اشاعت

456 صفحات — قیمت: 123/روپے

ذاکر حسین

گاہے گاہے باز خواں

ہندستان کی قومی زبان

ہندستانی کے بارے میں ہم جس بحث میں معروف ہیں وہ مجھے بے ساختہ موثیر کے ایک کردار ایم جورڈین کی یاد دلاتی ہے۔ یہ حضرت جنون کی حد تک وہ سب کچھ جاننے کے لیے بے چین رہا کرتے تھے جس سے ایک شائستہ آدمی کو واقف ہونا چاہیے۔ انھیں اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب ان کے استاد نے بتایا کہ وہ جو کچھ بولتے ہیں وہ نثر ہے۔ ان کے لیے یہ ناقابل قیاس تھا کہ وہ چالیس سال تک نثر بولتے رہے اور انھیں خود اس کا علم تک نہیں تھا۔ اپنے آپ کو اطمینان دلانے کے لیے انھیں بار بار یہ پوچھنا پڑا۔ "یہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ سب نثر ہے؟ میر اجو تا یہاں رکھ دو۔ میری نائٹ شرٹ دو۔ کیا یہ نثر ہے؟" اب اس کے بارے میں کیا کیا جاسکتا تھا؟ یہ سب کچھ تھا تو نثر ہی میں۔

کچھ یہی حال ہمارے ہم وطنوں کا بھی ہے جن کے لیے ہندستانی وہی کچھ ہے جو ایم جورڈین کے لیے نثر تھی۔ وہ اردو ہندی اور ہندستانی پر پڑا ہوا اسرار کا پردہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کام کو وہ اس طور پر انجام دے رہے ہیں کہ بنیادی نوعیت کے حقائق بھی انھیں پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہ گہرے غور و فکر میں ڈوب جاتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں اردو، ہندی یا ہندستانی کے تعلق سے کوئی سیدھا جواب دوں تو بہت سے لوگ ایم جورڈین کی طرح حیرت زدہ رہ جائیں گے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ جو اب بالکل آسان اور سیدھا ہے۔ ہندستانی وہ زبان ہے جسے ہمارے ملک کے لاکھوں لاکھ ہندو اور مسلمان بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ شمالی ہند میں عام استعمال کی زبان ہے۔ ملک کے باقی حصوں میں ایسے بہت سے لوگ آپ کو ملیں گے جو اسے جانتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے بولتے تو نہیں لیکن سمجھ لیتے ہیں۔ شہری علاقوں میں اس کا استعمال زیادہ ہی ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی بڑے شہر میں چلے جایئے، بہت سے لوگ اسے بولتے ہوئے ملیں گے اور بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو اسے سمجھتے ہیں۔

لیکن ایم جورڈین جیسے لوگ اس بات پر اعتراض کریں گے کہ میں جس زبان کا حوالہ دے رہا ہوں وہ ہندستانی نہیں بلکہ اردو ہے۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہندستانی اردو بھی ہے۔ ہندستانی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ نہ تو اردو بولنے والے کو اس میں کوئی دشواری پیش آتی ہے اور نہ ہندی بولنے والوں کو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک زبان داں کے طور پر مولوی عبدالحق صاحب کا کیا مقام ہے۔ انھوں نے انشاء اللہ خاں کی تصنیف "رانی کیتکی" کا تعارف کراتے ہوئے ہندستانی کی بڑے خوبصورت انداز میں تعریف کی ہے۔ "اسے اردو بولنے والے بھی سمجھ لیتے ہیں اور ہندی بولنے والے بھی۔ یہ مرزجہ اور صاف زبان ہے اسے ہندستانی کہتے ہیں"۔

لیکن یہاں یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ انشاء اللہ خاں نے "رانی کیتکی" میں عربی اور فارسی اصل کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا جبکہ وہ لوگ جو ہندستانی بولنے کا دعوا کرتے ہیں، ایسے بیسیوں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہم ان الفاظ کو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ وہ ہندستانی ہیں۔ ہندستانی میں عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ترکی، پرتگالی اور انگریزی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے اور کتنی زبانوں سے الفاظ لیے ہیں۔ کچھ ایسے پنڈت ہیں جو لفظوں کی اصل یا خاندانی رابطوں کے بارے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ میں ان سے ان کا یہ حق نہیں چھیننا چاہتا جس کے تحت وہ کسی لفظ کا رشتہ کسی خاص ملک یا خاص سماج میں تلاش کرتے ہیں۔ مجھے اور مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں افراد کو تو صرف اس بات سے سروکار ہے کہ وہ الفاظ جو خود بخود اور قدرتی طور پر ہماری زبان پر آجاتے ہیں اور جنھیں ہم ہر وقت استعمال کرتے ہیں وہ ہماری زبان کے الفاظ ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو ملے جلے پکوان کا مزہ نہیں لیتے۔ وہ کہتے ہیں۔ "یہ نہ ادھر کا ہے نہ ادھر کا، یہ نہ تو مچھلی ہے اور نہ مرغ۔ ہماری زبان تو ہماری ہی ہونی چاہیے، خالص جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو۔" میرا خیال ہے کہ اسی "طہارت پسندی" کے جنون نے آج ہندی اور اردو کو ایک دوسرے

● لنڈن نیشنل کانگریس نے قومی زبان کے موضوع پر جو اہم ترین دستاویز 1941ء میں شائع کی تھی قومی اردو کونسل اس کا اردو ترجمہ پہلی مرتبہ جلد ہی کتابی شکل میں شائع کرے گی۔ اس کتاب میں شامل ہمارے قومی رہ نماؤں کے تاریخی اہمیت کے مضامین ہر ماہ 'اردو دنیا' میں شائع کیے جارہے ہیں۔ اس ماہ ذاکر حسین کا مضمون شائع کیا جارہا ہے۔

کے خلاف لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا جو بہت دور کا زمانہ بھی نہیں ،جب لوگ ان دونوں کے فرق سے واقف بھی نہیں تھے۔ ممتاز اردو شعرا تک اپنی زبان کو ہندی کہتے تھے۔ یہ مسئلہ تو اُس وقت پیدا ہوا جب کچھ لوگوں نے عربی اور فارسی کے الفاظ کو ترک کرنا شروع کیا اور ان کی جگہ ان کے سنسکرت مترادفات تلاش کرنے لگے۔ اسی کے نتیجے میں مشترکہ زبان نے دو شکلیں اختیار کر لیں۔ ایک حلقے نے خالص ہندی لکھنا شروع کیا اور دوسرے نے عربی اور فارسی کے الفاظ سے زبان کو بوجھل بنانا شروع کیا۔ لیکن جو لوگ اردو بولتے ہیں، وہ ایک خاص حد سے آگے جا کر نامانوس الفاظ نہیں استعمال کر سکتے ۔اس جھگڑے میں پڑ کر جو ابھی شروع ہوا ہے، وہ صدیوں کے کارنامو ں کو تباہ نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان کا ڈھانچہ ہند ستانی ہے، اس کی قواعد ہند ستانی ہے اور کبھی اس نے اس بنیاد پر لفظوں سے نفرت کرنا نہیں سکھایا کہ فلاں لفظ بدیسی ہے یا کافروں کا ہے۔ پھر بھی جوابی کارروائی کے طور پر یا پھر کسی اور مقصد سے کچھ لوگ اپنی زبان کو عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے سجانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم روزمرہ بولی جانے والی زبان لکھنے کی کوشش کریں تو ہماری ادبی تخلیقات عام فہم، آسان، رواں دواں اور موثر، شائستہ اور دل کو لبھا لینے والی ہوں گی۔ عام استعمال کے الفاظ سے دامن نہیں بچانا چاہیے۔ بلاشبہ نامانوس یا بے تکے الفاظ تھوپنا غلط ہوگا۔ اسی صورت میں ہم ہند ستانی کو فروغ دے سکیں گے۔ لیکن زبان کو خالص بنانے کی یہ کوشش ہی کیوں کی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں ہندی اور اردو کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا؟ ان کوششوں کے پیچھے جو مقاصد کار فرما ہیں، ان پر ہمیں باقاعدہ غور کرنا چاہیے اور اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی نشاندہی بھی کرنی چاہیے۔ شاید یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگ اپنے تعلق سے اس طور پر سوچنے لگتے ہیں کہ صرف وہی چیزیں ان کی اپنی ہیں، جو خاص طور سے انھی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس صورت میں وہ ہر دوسری چیز کو غیر ملکی سمجھ کر نکال باہر کرتے ہیں۔ انھیں کچھ غیر ملکی عناصر سے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہے لہٰذا وہ ان تمام عناصر کو، جن میں ذرا بھی غیر ملک کا شائبہ نظر آتا ہے، قابل نفرت تصور کرتے ہیں۔ اپنی اس بے صبری کے عالم میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ غیر ملکی چیزیں دیسی بن جاتی ہیں اور کچھ غیر ملکی ہی کے طور پر باقی رہتی ہیں۔ کچھ نے ہماری زندگی کو تنگ دیواروں کے اندر محصور کر دیا لیکن کچھ نے ہمارے اندر آزادی کا دوہرا ولولہ پیدا کیا۔ باہر سے آنے والی ہوائیں ہمیشہ بربادی کا باعث نہیں بنتیں بلکہ کچھ ایسی ہوائیں بھی آتی ہیں جو زرخیزی اور پھول بکھیرتی ہیں۔ ان دونوں کا فرق محسوس نہ کرنا ایسی لاعلمی ہے جو خودکشی کے مترادف ہے۔

جو لوگ ہند ستانی سے غیر ملکی الفاظ کو چن چن کر باہر نکالنے کے درپے ہیں وہ میرے خیال میں اسی قسم کی غلطی کر رہے ہیں۔ انھوں نے ان ہواؤں کو جو زرخیزی اور پھول ہمارے ملک میں لائی تھیں اور ہمیں ایسی تازگی سے روشناس کرایا تھا جو اب بھی موجود ہے، غلطی سے ایسی تیز و تند آندھی سمجھ لیا جو اتری لاتی ہے اور سب کچھ برباد کر دیتی ہے۔ تکلف برطرف، جو لوگ ہند ستانی سے عربی اور فارسی کے الفاظ خارج کرنا چاہتے ہیں وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو چیزیں صدیوں کے ہندو مسلم اشتراک سے وجود میں آئی تھیں وہ خالص نہیں ہیں لہٰذا ملاوٹ والی چیزوں کو ہر قیمت پر ختم کرنا ہے۔ لیکن وہ اس بات سے ناواقف نظر آتے ہیں کہ یہ غیر ملکی عنصر ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ اسے ختم کرنے کے لیے انھیں اردو سے صرف فارسی اور عربی کے الفاظ ہی نہیں نکالنے ہوں گے، انھیں تلسی داس، سورداس اور کبیر داس کی زبان کو بھی "پوتر" بنانا ہوگا۔ اور یہ ایک ویسی ہی پاگل پن کی مہم ہوگی کہ گنگا اور جمنا کو مجبور کیا جائے کہ وہ کہیں ایک دوسرے میں نہ ملیں بلکہ سمندر میں جا ملنے تک اپنا الگ الگ راستہ طے کریں۔

اور اگر ہم اصولاً غیر ملکی عناصر کو نکال باہر کرنا اہم یا ضروری سمجھتے ہیں تو پھر صرف زبان ہی پر اکتفا کیوں کریں؟ کیوں نہ مختلف لسانی اور نسلی حلقوں میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص خالص سودیشی کلچر ہو، اس کا اپنا ملک اور آزاد حکومت ہو! اس صورت میں ہماری تاریخ اپنا ایک چکر پورا کرے گی اور ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ ممکن ہے کہ اس منطق اور "پوتر تا" کے قائل کچھ لوگوں کی یہ خواہش ہو اور وہ اسے حاصل بھی کرنا چاہتے ہوں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ چہرے کو بہتر بنانے کے لیے ناک ہی کاٹ لی جائے۔ کچھ سر پھرے تو گردن بھی کاٹ سکتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی ہند ستانی جسے اپنے ہم وطنوں کی عقلیت پسندی پر ذرا بھی اعتماد ہوگا وہ اس بات پر مشکل سے یقین کرے گا کہ یہ تمام چیزیں اس طرح کے جنون کی بھینٹ چڑھ جائیں گی۔

غیر ملکی الفاظ کو خارج کرنے کے ساتھ ساتھ ہم ایک غلطی اور کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اُن الفاظ کی اصل شکل بحال کرنا چاہتے ہیں جنھیں ہم نے دوسری زبانوں سے لیا تھا اور اپنی ضرورت اور مقصد

کے مطابق ان کے تلفظ اور معانی وضع کیے تھے۔ یہ بھی وہی بات ہے جیسا کہ ہم ہندستانی میں کہتے ہیں کہ آنکھوں کو ان کے خول سے نکال کر ناک پر چپکانے کی کوشش کرنا۔ اسے ان لوگوں کی سنک بھی کہا جاسکتا ہے جو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قیمتی پتھر اس وقت تک لعل وجواہر نہیں کہلاتے جب تک کہ انھیں تراش کر زیورات میں جڑ نہیں دیا جاتا۔ کچھ یہی بات لفظوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ الفاظ بھی تراش خراش کے عمل سے گزرتے ہیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ زبان انھیں ایک خاص شکل عطا نہیں کر دیتی اور دماغ انھیں خاص معانی نہیں بخش دیتا۔ اس عمل کو جس کی تکمیل میں صدیاں صرف ہو جاتی ہیں، چند نام نہاد عالم فاضل افراد کے محض جھوٹے وقار اور علمیت کی تسکین کی خاطر مخالف سمت کو نہیں موڑا جاسکتا اور نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ وہ الفاظ جو ہماری ہندستانی زبان کا جزو بن چکے ہیں، وہ ہندستانی ہی کے الفاظ ہیں اور ہم ان کے جو معانی اور شکل متعین کرتے ہیں، ان کے علاوہ ان کے نہ کوئی دوسرے معانی ہوتے ہیں اور نہ شکل۔ ان لفظوں کی اصل سے کسی ماہر لسانیات کو تو دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن ہمیں نہیں کیونکہ ہماری اصل دلچسپی اس زبان سے ہے جسے ہم بولتے اور سمجھتے ہیں۔

جو لفظ ہندستانی میں داخل ہو چکے ہیں اور جنھیں ہندستانی کے لفظ کے طور پر عام مقبولیت حاصل ہو چکی ہے وہ بہر حال ہندستانی ہیں۔ اب ہمیں غور اس بات پر کرنا ہے کہ یہ زبان جس کی منفرد شکل اور کھرے پن کا میں نے یہاں دفاع کیا خود کفیل ہے یا اس کے وجود کا دارومدار کسی بیرونی سہارے پر ہے؟ کیا اس سے ہمارے سارے مقاصد پورے ہو جائیں گے یا صرف روزانہ کی عام ضروریات یا کچھ قصے کہانیوں تک ہی یہ ہمارا ساتھ دے سکے گی؟ ہماری زندگی کا ہر دن دنیا میں ہونے والی نت نئی ترقیوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ان میں نئی ایجادات اور نئی مصنوعات، نئے حالات اور خیالات، سبھی شامل ہیں لہٰذا ہماری زبان کو بھی اس بدلتی ہوئی زندگی سے رشتہ استوار کرنا ہوگا۔ کیا ہمیں اس طور پر اپنا ذہن تیار کرنا چاہیے کہ ہمارا ذخیرۂ الفاظ جیسا ہے ویسا ہی رہے اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نئے حالات میں بھی گھوم پھر کر ہم اسی سے کام چلائیں گے یا یہ کہ باہر سے کچھ نئے لفظ اس میں داخل کریں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ زبان کی ترقی میں رکاوٹ ڈالے۔ ہمیں نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ اور نئی چیزوں کے لیے نئے ناموں کی ضرورت ہر حال میں پیش آئے گی۔ تو پھر وہ الفاظ آئیں گے کہاں سے؟ میرا خیال ہے کہ جو الفاظ ہم اخذ کرتے ہیں وہ نئے ہیں۔ یا پرانے، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ البتہ اتنا ضرور پیش نظر رہنا چاہیے کہ جو الفاظ لیے جائیں وہ بے تکے اور صوتی اعتبار سے ناقابل قبول نہ ہوں۔ ایسے الفاظ ہمیں پہلے گانوؤں کی بولیوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو قدرت سے قریب ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کے دھارے کے ساتھ بہتے ہیں، یہ کنارے پر بیٹھے بزعم خود اپنی دنیا میں گم نہیں رہتے۔ میرا یقین ہے کہ اگر اس طرح ہم الفاظ تلاش کریں گے تو اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔ پھر ہمیں ان اصطلاحات پر غور کرنا پڑے گا جو ہمارے دستکاروں اور کاریگروں نے ایجاد کیے ہیں۔ مجھے اس بات پر قطعی حیرت نہیں ہوگی اگر یہ پتا چلے کہ بہت سے ایسے الفاظ اور اصطلاحیں جن کے لیے ہم عربی یا سنسکرت کی موٹی موٹی ڈکشنریاں دیکھتے ہیں پہلے ہی سے رائج ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ کس حد تک ہمارا ساتھ دیں گے اور کتنے موزوں ہیں۔ جب ہم ان دونوں وسائل سے الفاظ تلاش کر کر کے تھک جائیں اور ہماری ضرورت جب ان سے پوری نہ ہو تو پھر ہمیں غیر ملکی اصطلاحوں اور ناموں کو قبول کر لینا چاہیے۔ اگر ان کے تلفظ میں کوئی دشواری پیش آتی ہو تو مناسب تبدیلی کر کے ہم انھیں آسان بنا سکتے ہیں۔ جب ہم ان اصطلاحات کو اخذ کر لیں تو ہم انھیں اپنی زبان کے لفظ تصور کریں، قواعد کے جو اصول ہم دوسرے الفاظ کے ساتھ روا رکھتے ہیں وہی ان کے ساتھ بھی روا رکھیں۔ انھیں ہندستانی الفاظ سے ہم آہنگ کر دیں اور اس بات کا خیال نہ کریں کہ کون سا لفظ حال میں اخذ کیا گیا ہے اور کون سی اصطلاح پہلے ہی سے رائج ہے۔ ہمیں اپنی سائنسی اصطلاحات بڑے پیمانے پر غیر ملکی زبانوں سے لینا پڑیں گی اور اس ضمن میں یہ بات بڑی سودمند ہوگی کہ اردو اور ہندی بولنے والے ایک ہی اصطلاح قبول کرنے پر متفق ہو جائیں ورنہ ایک کی سائنسی اصطلاحات دوسرے کے لیے مشکل ہی سے قابل استعمال ہوں گی۔ اس کے باوجود بہت سے الفاظ عربی اور سنسکرت سے بھی لینے ہوں گے اور یہاں بھی اسی معیار کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ منتخب کی گئی اصطلاحیں موزوں ہوں، ان کا تلفظ آسان ہو اور وہ ممکنہ حد تک ہماری زبان کی اسپرٹ سے مطابقت رکھتی ہوں۔ زبان کی "طہارت" یا صفائی جیسی چیز کو قطعی قابل غور نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہمارا شروع ہی سے یہ اصول رہا ہے اور یہی

اصول ہمیں اب بھی اپنانا چاہئے کہ یہی ہندستانی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

اگر ہندی اور اردو بولنے والے نئی اصطلاحات کے انتخاب کے سلسلے میں نیز انھیں اخذ کرنے کے تعلق سے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کریں، اگر ہماری نصابی کتابیں اسی زبان میں لکھی جائیں، اگر اخبارات بول چال کی زبان سے گریز نہ کریں، اگر ریڈیو اسٹیشن، ہمارے تھیٹر اور سینما ایک ایسی مشترکہ زبان کو عام کرنے کا فیصلہ کریں جو عربی اور سنسکرت کے دقیق الفاظ سے بوجھل نہ ہو تو ہندستانی کو اردو اور ہندی کے خانوں میں تقسیم کرنے کی تحریک خود بخود کمزور پڑ جائے گی۔ کم از کم عام بات چیت کے لیے ہمارے پاس ایک زبان تو ہوگی جو کاروبار اور اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر ہمارے کام آئے گی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی خاص مدت تک سماجی علوم کے لیے ذریعہ تعلیم دو زبانیں ہوں اور ہمارے شعرا پر اشعار اردو اور ہندی میں نازل ہوں لیکن میں یہ ماننے کو میں تیار نہیں ہوں کہ آرٹ، ادب اور شاعری جیسے شعبے بھی مشترکہ زبان یعنی ہندستانی بولنے کے رجحان کی نفی کریں گے۔

ادب لمبے عرصے تک محض ایک اعلیٰ طبقے کی دلچسپی اور مصروفیات کا محور نہیں رہ سکتا۔ زبان کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کا تعلق سماج سے ہوتا ہے۔ زبان انسان کو انسان سے اور دل کو دل سے جوڑتی ہے۔ انفرادی طور پر کسی ایک آدمی کی کوئی زبان نہیں ہوتی لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ہمارے ادیب یہ محسوس کریں گے کہ انھیں قاری کے بہت بڑے حلقے تک اپنی بات پہنچانی ہے اور عوام بھی بڑی تعداد میں یہ محسوس کریں گے کہ انھیں وہ باتیں سمجھنے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ویسے ویسے ادب زندگی کے قریب آتا جائے گا اور ہماری زبان صاف اور آسان ہوتی جائے گی۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے وہ ادیب بھی جو دنیا سے بیگانگی برتتے ہیں اور اپنی تحریروں میں خدا جانے کس کو مخاطب کرتے ہیں بہر حال انسان ہی ہیں کنویں کے مینڈک نہیں جو اپنے آپ ٹراتے رہتے ہیں اور پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہ ادیب اپنے ساتھیوں سے بہر حال رابطہ رکھنا چاہتے ہیں اور وہ یقیناً ایک دن مجبور ہوں گے کہ اپنی زبان اور طرز اظہار کو آسان بنائیں تاکہ ان کی باتیں لوگوں کی سمجھ میں آئیں۔ زبانوں کے طلبہ اس بات سے واقف ہیں کہ کوئی بھی بولی جب بہت زیادہ عام ہوتی ہے، تو وہ لوگ جو صرف سنتے اور پڑھتے ہیں، وہ ان لوگوں کے مقابلے میں اس پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، جو اسے پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں، اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ زبان تو سماج کی ملازمہ یا داسی ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں سے منھ نہیں موڑ سکتی جن کی خدمت کرتی ہے۔ زبان تو بغیر کسی سہارے کے خود اپنے اظہار کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ شاعری میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو بالکل ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے اور جو اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ یہ ایک طرح کا روحانی سکون ہوتا ہے جس کی شاعر کو تلاش ہوتی ہے۔ یہ کبھی ٹھنڈی سانس میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی چیخ میں اور کبھی خوشی میں۔ لیکن اس صورت میں بھی شاعر کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اسے سنا اور سمجھا جائے۔ اکثر کسی ویران جنگل میں کسی سوکھے پیڑ پر بیٹھی کوئی چڑیا چہچہاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ خود ہی گاتی ہے اور خود ہی سنتی ہے لیکن صحیح معنوں میں ہرے بھرے جنگلات اور باغوں ہی میں خوش الحان پرندوں کی آوازیں نغمے بکھیرتی ہیں۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ ہمارے شعرا و ادبا جلد ہی ہندستانی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کریں گے۔ صاف اور آسان زبان میں جو ہر روز کی معمول کی زبان ہے، وہ زبان جس کے پرانے الفاظ اس بنیاد پر نکالے نہیں جائیں گے کہ وہ غیر ملکی ہیں اور جس میں لگاتار نئے الفاظ لیکن اس کے ذخیرۂ الفاظ کو عربی اور سنسکرت کے الفاظ سے صرف اس لئے بوجھل نہیں بنایا جائے گا کہ یہ سنسکرت اور عربی کے الفاظ ہیں۔ یہ زبان تو مشترکہ زندگی کی علامت، ماضی کی کامیابیوں کو نذرانۂ عقیدت اور مستقبل کے حوصلوں اور امنگوں کا پیمان وفا ثابت ہوگی۔

(ترجمہ: معین اعجاز)

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔

پہلی اشاعت

646 صفحات قیمت : 200 روپے

سید شہاب الدین

اردو زبان، تعلیم اور مسلمان: ایک تثلیثِ بے کلیسا

اردو دنیا کے دسمبر 2000 کے شمارے میں پروفیسر چودھری محمد نعیم کا مضمون ''ہندستان میں اردو: چند معروضات'' (ترجمہ پروفیسر اے۔ آر۔ فتیحی) ہندستان میں اردو کی حیثیت اور اس کے مستقبل کے امکانات کے بارے میں کئی ایسے دل چسپ سوالات اٹھاتا ہے جو مزید بحث و تمحیص کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اردو تعلیم کا ابہام: میں اپنی بات کا آغاز اس معروضے سے کرنا چاہتا ہوں کہ ''اردو تعلیم'' کے لفظ میں غیر معمولی شاعرانہ ابہام ہے اور اپنے مضمون میں نعیم صاحب بھی اس ابہام کے حصاروں کو توڑنے میں ناکام رہے ہیں۔ اول تو ہندستان میں اردو کی تعلیم اور اردو کے ذریعے تعلیم کو جو دو بالکل مختلف موضوعات ہیں، انھیں اردو کی عمومی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اردو تعلیم کی اصطلاح میں مدغم کردیا جاتا ہے دوم، اردو زبان کو درپیش مسائل میں اردو کے تعلیمی مسائل کی حد بندی معاملات کے صحیح تجزیے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ان حدود کا لحاظ کیے بغیر جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ گمراہ کن ہی ہوسکتے ہیں۔ جہاں تک اردو تعلیم کے موضوع کا سوال ہے تو اس میں ''ایک لازمی اختیاری مضمون کے طور پر اردو زبان کا مطالعہ'' یا ''غیر لازمی مگر اختیاری مضمون'' اور ''اردو ذریعۂ تعلیم'' تین ایسے ذیلی مگر مستقل بالذات موضوعات ہیں جو علاحدہ علاحدہ تجزیے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ زبان کے طور پر اردو کو شاملِ نصاب کرنے کا معاملہ اسکول کالج اور یونیورسٹی تمام سطحوں پر تجزیے کا متقاضی ہے جب کہ کم از کم پرائمری سطح پر اردو ذریعہ تعلیم کی صورتِ حال کا تجزیہ ہماری خصوصی توجہ چاہتا ہے اس لیے کہ پرائمری تعلیم کے بعد تعلیمی نظام میں زبانوں کے انتخاب کا معاملہ اور ذریعہ تعلیم کا معاملہ بڑی حد تک طالبِ علموں کی اس لسانی استعداد پر انحصار کرتا ہے جس کی عمارت پرائمری تعلیم ہی کے زمانے میں استوار ہوتی ہے۔

اردو اور مسلمانانِ ہند کا رشتہ: کسی بھی سطح پر ہندستان میں اردو کی صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ہر مصنف کا ذہن اردو اور مسلمانوں کے رشتے کی طرف ضرور متوجہ ہوتا ہے خواہ وہ اسے اپنے تجزیے میں نوکِ قلم پر پوری طرح نہ لائے۔ اس رویے سے موضوع ابہام کا شکار ہو جاتا ہے۔ اردو اور مسلمانوں کے تعلق سے ادھورے مباحث بھی اردو کے عمومی مسائل کو مزید الجھاتے رہے ہیں۔ پروفیسر نعیم کا مذکورہ مضمون بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں اور مسلمانوں سے معاصر ہندستان میں اردو کے رشتے کا انھوں نے جس طرح تجزیہ کیا ہے اس سے اردو زبان اور تعلیم دونوں کا معاصر منظر نامہ اور دھندلا گیا ہے۔

یہ تسلیم کہ مذہب اور زبانیں ایک ہی سکے کے دو رُخ نہیں مگر ہندستان میں اس حقیقت کو کیا کہیے کہ اردو کو اپنی مادری زبان درج کرانے والے لوگوں کا 99.9 فی صد مسلمان ہیں اور اب اردو اور کم از کم شمالی ہندستان کے مسلمانوں کی مذہبی شناخت کے دائرے ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہوئے ہیں کہ انھیں علاحدہ کرنا ممکن نہیں۔ اس اتفاق کو بھی کیا کہیے کہ 1991ء کی مردم شماری میں اردو کو اپنی مادری زبان درج کرانے والی آبادی تو ہندی مسلمانوں کا 61.2 فی صد ہے لیکن اردو کو اپنی مادری زبان درج کرانے والا شاید ہی کوئی غیر مسلم ہو۔ اردو اس طرح اب صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے گو یہ تمام ہندستانی مسلمانوں کی مادری زبان نہیں ہے بلکہ ان کا صرف 55 فی صد اس زمرے میں شامل ہے۔

مسلمانوں کے تعلیمی ادارے: اردو کے سیاق و سباق میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک لازمی یا اختیاری زبان کے طور پر اردو کی تعلیم اور اردو کے ذریعے تعلیم، یہ دو ایسے موضوعات ہیں جنھیں ان تعلیمی اداروں کے نظام سے بالکل الگ کرکے دیکھنا چاہیے جو آئین کی دفعہ 30 کے تحت مذہبی اقلیتیں قائم کرسکتی ہیں۔ مسلمانوں نے بھی ایسے ادارے قائم کیے ہیں جن کا احتساب کم از کم اترپردیش کی سطح پر جناب احمد رشید شیروانی اور بیگم نصرت شیروانی مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ یہ تخصیص اس لیے بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ایسے تمام تعلیمی ادارے ضروری نہیں کہ اردو کی تعلیم یا اردو کے ذریعے تعلیم کا نظم کرتے ہی ہوں۔ ان علاقوں تک میں جہاں اردو لسانی اقلیت کی قابلِ لحاظ آبادی ہے، مسلمانوں کے مندرجہ بالا نہج کے ادارے بالعموم اردو میڈیم سے تعلیم کا نظم نہیں کرپاتے۔ مثلاً اترپردیش میں مسلمانوں کے کسی بھی ادارے میں اردو میڈیم سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے کا نظم اس لیے نہیں ہے کیونکہ وہاں کا واحد ''بورڈ آف ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن اترپردیش، الٰہ آباد''

اردو میڈیم سے امتحان دینے کی اجازت ہی نہیں دیتا ہے جبکہ وہاں ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے امتحانات ہندی اور انگریزی میڈیم سے دیے جاسکتے ہیں۔ ان اداروں میں لازمی مضمون تو درکنار ایک اختیاری مضمون کے طور پر بھی اردو تعلیم کا نظم اس علاقے کے عمومی تعلیمی حالات، سرکاری سطح پر منظور شدہ نصاب میں اردو کی گنجائش اور والدین کی ترجیح پر منحصر ہے۔ اور آخر الذکر کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ بڑھ نہیں رہی گھٹ رہی ہے۔ اسی لیے اردو کے سیاق وسباق میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک ہی علاقے کے مسلم تعلیمی اداروں کا تقابل کیا جائے یا اس علاقے کے ایسے اداروں کا تقابلی جائزہ لیا جائے جن کا نظم حکومت یا غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے اور اردو لسانی اقلیت کے بچے وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تجزیے کا یہ طریق کار اپنے آپ میں گمراہ کن ہے۔ اردو لسانی اقلیت کے لیے سماجی اور معاشی سطح پر جو پیچیدگیاں ہیں ان کا تجزیہ واقعی آسان نہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ اپنے مضمون کی اولین اشاعت کے وقت پروفیسر نعیم نے جناب فیروز بخت احمد اور ان کے ادارے فرینڈس فار ایجوکیشن کے اعداد و شمار کیوں کر نقل کیے کیوں کہ ان کا استناد مشکوک اور اردو تعلیم کے تناظر میں ان کے تجزیے کا طریق کار درست نہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ایک ہی تعلیمی سال کے سکنڈری یا سنیئر سیکنڈری سطح کے بورڈ کے نتائج کے اعداد و شمار دستیاب ہوں تو ان میں اردو لسانی اقلیت کے ان بچوں کا تناسب معلوم کیا جائے جنھوں نے اردو میڈیم سے امتحان دیا ہو۔ ایسا کرتے وقت ہمیں اس امر سے قطع نظر کر لینا چاہیے کہ ان میں پاس / فیل ہونے والوں کا تناسب کیا ہے؟ اور ان میں سے کتنوں کا تعلق ان گھرانوں سے ہے جو پہلی بار تعلیم کے دائرے میں شریک ہو رہے ہیں؟ مگر یہ کام جس معیار کے تجزیے کا طالب ہے فیروز بخت احمد صاحب اس کے متحمل نہیں ہو سکے۔

[میرا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف ہے کہ اب بالعموم ثانوی سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا مشکل ہے لیکن کم از کم یہ تو کوشش کی جائے کہ اردو داں بچے ثانوی سطح پر اردو بحیثیت زبانِ اول پڑھیں اور ثانوی تعلیم ختم کرنے تک اتنی استعداد یا دل چسپی پیدا کر لیں کہ اردو اس نئی کمپیوٹر کے سہارے جی سکے۔ میں اردو میڈیم ہائی اسکولوں کے یکسر خلاف نہیں ہوں۔ کم از کم ہر اردو اکثریتی ضلع میں ایک سرکاری اردو میڈیم اسکول ہونا چاہیے تاکہ وہ یونیورسٹی سطح کے ادبی اردو کورسوں کے لیے طلبہ مہیا کر سکے اور اعلا مدارس کے طلبہ کا آدان پردان کر سکے۔]

اردو آبادی کے اعداد و شمار: عمومی تجزیے کی حد تک مجھے اس پر بھی تعجب ہے کہ پروفیسر نعیم نے بھی سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے 1981ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار نقل کیے جب کہ 2000ء میں جب انھوں نے اپنے مضمون کے اردو قالب کی اشاعت کے لیے اس پر نظر ثانی کی تو 2001ء کی مردم شماری کا کام شروع ہو چکا ہے اور 1991ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو منظر عام پر آئے ہوئے تو عرصہ ہو گیا۔ یوں مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ 1991ء کی مردم شماری کی بنیاد پر اردو لسانی اقلیت کی تعداد کے تناسب سے کیا گیا ہر تجزیہ آج ساقط الیعاد ہونے کی وجہ سے ناقص کے ذیل میں آئے گا۔

ایک سطح پر میں پروفیسر نعیم کے ان عمومی اصولوں سے اتفاق کرتا ہوں جو انھوں نے ہندستان میں اردو کی موجودہ حیثیت کا تعین کرنے کے لیے منطبق کرنے کا عندیہ دیا ہے مگر ان میں کئی جگہ تضاد بھی ہے۔ پروفیسر نعیم کتب کی اشاعت کو زبان کی حیثیت سے اردو کی ترقی اور زوال کا ثبوت ماننے کے لیے تیار نہیں مگر از خود اپنے مضمون کے بڑے حصے میں انھوں نے اسی زاویے سے فیصلے صادر کیے ہیں اور حکم لگایا ہے۔ میں خود کتب کی اشاعت کو اردو کی صورتِ حال کے جائزے میں فیصلہ کن عنصر نہیں مانتا کیوں کہ ہندستان میں اردو کا مستقبل دراصل ان لوگوں پر منحصر ہے جو مہارت کے ساتھ اس زبان کو بول لکھ اور پڑھ سکتے ہیں خواہ وہ کتابیں اور رسالے خرید نہ سکیں۔ مردم شماری کے اعداد و شمار ہمیں صرف ان لوگوں کی تعداد بتاتے ہیں جو اردو کو اپنی زبان کے طور پر درج کراتے ہیں۔ ان میں یقیناً ناخواندہ لوگوں کی اکثریت ہے یا پھر ان کی جو کسی سطح پر اسکول تو گئے مگر اسکول میں اردو تعلیم کی سہولت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس زبان کو لکھنے اور پڑھنے میں مہارت حاصل نہ کر سکے۔ یہی منطق اس سوال کا جواز فراہم کرتی ہے کہ آبادی کے فطری اضافے کے ساتھ اردو کو اپنی مادری زبان لکھانے والوں کی تعداد میں تو اضافہ ہو رہا ہے مگر اردو کے نصابی مواد کی اشاعت روز بروز گھٹ رہی ہے۔

اردو کا عالمی عروج: اصولاً تو چودھری محمد نعیم کی یہ بات ٹھیک ہے کہ جب تک پاکستان میں اردو زندہ ہے ہمیں اردو کے عمومی مستقبل کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں مگر ہندستان میں اردو کی بقا کا معاملہ مختلف ہے اور پاکستان میں اس کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے سے ہندستان میں اس کی بقا و ترقی کے امکانات کا کچھ تعلق نہیں۔ ہندستان میں اردو کے مستقبل کا تعلق ہندستان کے مخصوص معاشرتی تناظر سے ہے اور پاکستان، خلیجی ممالک، امریکہ یا برطانیہ کہیں بھی اردو کی

ترقی ہندستان میں اردو کے حالات کو بدل نہیں سکتی۔ اس لیے بین الاقوامی سطح پر اگر اردو ترقی بھی کرے تب بھی ہندستان میں اردو والوں کی نئی نسلوں کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آزادی کے بعد اردو تعلیم کا نظام فنا ہونے کے بعد نئی نسلیں اردو اور اس کے عظیم ادبی اور علمی سرمایے دونوں ہی سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔

ہندستان میں اردو کی زوال پذیر ہوتی ہوئی صورت حال کا بدل یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر تشفی دیں کہ دوسرے ملکوں میں تو اردو بڑھ رہی ہے۔ یوں ہم اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بھی بیٹھے رہیں تو کچھ قباحت نہیں!

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی: مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی مسلم ہے مگر ملک کی تعلیمی ترقی سے مسلمان بھی مستفیض ہورہے ہیں اور اب خود بھی اس میدان میں کوشاں ہیں مگر سرکاری نصاب میں اردو سے بے اعتنائی بلکہ اردو کی جلاوطنی سے (مثلاً دہلی سرکار کے حالیہ فیصلے کے مطابق ابتدائی سطح پر انگریزی لازمی ہوجائے گی ہندی پہلے سے لازمی ہے تو بھلا کسی اقلیتی زبان کی گنجائش کہاں رہ جائے گی) اردو کے لیے خصوصاً اور دیگر تمام لسانی اقلیتوں کے لیے بھی ہر جگہ آہستہ آہستہ Academic Space گھٹتا جارہا ہے۔ والدین اب بچوں کو اسکول بھیجنے پر آمادہ ہیں مگر سیاسی ناتوانی ایسی ہے کہ وہ ان بچوں کے لیے ان کا آئینی حق بھی نہیں مانگ سکتے۔ وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ گھر میں تو ہم اردو بولتے ہی ہیں، برابر کی مسجد کے مکتب میں اردو حروف سے آشنائی بھی ہوگئی ہے، اب اس کے آگے اردو پڑھنے سے کیا فائدہ ہے؟ مجھے خوف ہے کہ مستقبل قریب میں آندھراپردیش، کرناٹک، اور بہار جیسی ریاستوں میں بھی مسلمان بچوں میں اردو کے ذریعے اور اردو بحیثیت لازمی یا اختیاری مضمون پڑھنے والوں کا تناسب تیزی سے گھٹتا جائے گا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تعلیم کے میدان میں مسلمان ضرور آگے بڑھیں گے مگر اس میں شک ہے کہ اردو بھی آگے بڑھے گی!

ہندستان میں اردو زبان اور اردو تعلیم کے مستقبل کے امکانات کا جائزہ لینے میں ان کتابوں کی اشاعت کی بھی چنداں کوئی اہمیت نہیں جنھیں لائبریری آف کانگریس واشنگٹن ڈی سی خریدتی ہے اور جن پر پروفیسر نعیم نے اپنی ایک اہم دلیل کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کتابوں کی تعداد اشاعت میں اضافہ ہندستان میں اردو زبان و تعلیم کے مسائل کو حل کرنے میں ذرہ بھر بھی معاون نہیں ہوسکتا۔ ویسے اکثر اردو کتابوں کی اشاعت اردو زبان کے منظرنامے کو متاثر نہیں کرتی۔ پھر ان کتابوں کی اشاعت کے پس پشت جو سرکار کی علامتی سرپرستی کی پالیسی کارفرما ہے وہی تو بڑی حد تک اردو کے زوال کی ذمے دار ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جتنے 'ٹائیٹلز' حکومت کے مطابق ہر سال بازار میں آتے ہیں وہ واقعی اتنی تعداد میں شائع بھی ہوتے ہوں جتنی تعداد ان کتب پر درج ہوتی ہے۔ اکثر صورتوں میں سرکاری تعاون سے شائع ہونے والی کتابوں کی سو پچاس کاپیاں ہی شائع ہوتی ہیں یوں ان کتابوں کو Ghost publications کہا جاسکتا ہے۔ ویسے اس امر پر میں اور نعیم صاحب دونوں ہی متفق ہیں کہ معیار سے موضوعات کے تنوع تک اردو میں معیاری کتب کا فقدان ہے اور ہندستان اور پاکستان میں شائع ہونے والی کتب کے موازنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں غالب رجحان شاعری، افسانے اور ادب تک محدود ہے اور ہیومنیٹیز، سوشل سائنس اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں شاذ ہی کتب شائع ہوتی ہیں۔

اشاعتِ کتب: اردو کتب کی اشاعت کے مجموعی تعلق سے پروفیسر نعیم نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا قطعی جواب بھی کسی کے پاس نہیں مگر اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اردو کی تعلیم کے مناسب نظم کا فقدان اردو کے ہر مسئلے کی جڑ ہے اور تعلیم کی سہولیات موجود نہ ہونے کی وجہ سے اردو والوں کی نئی نسل کے لوگ اب اسے ایک ایسی زبان کے طور پر اختیار کرنے پر مجبور ہیں جسے وہ صرف بول سکتے ہیں، پڑھ اور لکھ نہیں سکتے۔ تحریری زبان کے فقدان کا مسئلہ اتنا شدید ہے کہ جماعتِ اسلامی کو اپنی کتابیں شمالی ہند کے مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے ہندی میں شائع کرنی پڑتی ہیں کیوں کہ اب ہندی ہی واحد زبان ہے جس کے ذریعے مذہبی جماعتیں اپنی بات پُراثر طریقے سے نئی نسل تک پہنچا سکتی ہیں۔ خود نعیم صاحب کو بھی مذہبی جماعتوں کے وسائلِ ترسیل سے دلچسپی ہے اور اپنے تجسس کا اظہار انھوں نے واضح لفظوں میں کیا بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کے ذرائع ترسیل کے طور پر اردو کا کردار ہمارے ماہرین کی فکر کا ایک جزو ضرور ہے۔

رسم خط کا سوال: اردو والوں پر مختلف طریقوں سے ہمیشہ ہی شدید دباؤ اس بات کے لیے ڈالا جاتا ہے کہ وہ اس کا رسم خط تبدیل کرکے اسے دیوناگری میں لکھنا شروع کردیں۔ میں نعیم صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے تبدیلیِ رسم خط کی تحریک کی حمایت نہیں کی۔ ہندی اور اردو کا معاملہ یہ ہے کہ دوسری بہت سی زبانوں کی طرح ان کے ابتدائی سرچشموں میں یکسانیت کے باوجود اب اردو۔ ہندی دو بالکل مختلف زبانیں ہیں، بھلے ہی دونوں میں اکثر یکساں سماجی ماحول کی

عکاسی ہوتی ہے۔ اردو کا معاملہ اب ہندی کے ساتھ بولی جانے والی زبان کے مشترکہ عناصر تک محدود نہیں، نہ ہی اردو کا مستقبل ممبئی کی فلموں کی زبان تک محدود ہے۔ اردو کا معاملہ ایک ایسی قومی زبان کی حیثیت کا معاملہ ہے جو ہندی سے مختلف ہے۔ ایسے دلائل بالعموم وہ لوگ دیتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح اردو کو ہندی میں مدغم کرنے کے خواہش مند ہیں اور چاہتے ہیں کہ اردو والے اردو کی حیثیت ہندی کی ذیلی (dialect) کے طور پر قبول کرلیں۔ اردو کے ساتھ ہندی والوں کے اس رویئے کا ایک سبب ہندی کو اقتدار کے حصول کے لیے استعمال کرنا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برسوں سے ہندی کو اقتدار کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا بھی جاتا رہا ہے، اس میں کسی کو شک نہیں۔ رسم خط تبدیل کرنے کی یہ دلیل ہندی والے کسی دوسری ہند ستانی زبان کے لوگوں کو دینے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ دراوڑ لسانی خاندان کی زبانوں مثلاً تمل، تیلگو، ملیالم اور کنڑ کی تو بات ہی چھوڑیے، اپنا رسم خط چھوڑ کر دیوناگری رسم خط اختیار کرنے کی تجویز تو بنگلہ، پنجابی، مراٹھی، گجراتی اور آسامی کو بھی دینے کا حوصلہ ہندی والوں میں نہیں۔ اپنے رسم خط کو ترک کرنے کا دباؤ صرف اور صرف اردو پر بڑھایا جاسکتا ہے جو اردو کی لسانی شناخت کو فنا کرکے ہندی میں مدغم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر اردو والے اردو کو اس کی اصل حیثیت اور شناخت کے ساتھ زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اس طرح کے ہر دباؤ کے سامنے مسلسل سینہ سپر رہنا ہوگا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اردو کے متعدد اہلِ قلم بھی اپنے مفادات کے حصول کے لیے اکثر اردو کو دیوناگری میں لکھے جانے کی تحریک میں شامل رہے ہیں مگر ابھی ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی ہے۔

[یہ بے انتہا افسوس کی بات ہے کہ اردو اشرافیہ اپنے بعض سیاسی مفادات کے حصول کی غرض سے کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو درس و تدریس اور تحقیق کے انتظامات کے لیے کوشاں رہا مگر اس نے کبھی پرائمری تا سکنڈری سطح پر کسی بھی حیثیت سے اردو کی تعلیم کے نظم کے لیے حکومت پر دباؤ نہیں ڈالا۔ حکومت کے لیے یہ صورتِ حال نعمتِ غیر مترقبہ تھی جسے اردو کی جڑوں کو کھوکھلا کرکے مصنوعی پھول پتیوں کی اردو بیل سے سیکولرزم کی عمارت سجانے میں کبھی کوئی تکلف نہیں رہا۔ اردو بولنے والے لوگ اردو کے لیے حکومت کے نمائشی کاموں سے گمراہ ہوتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پرائمری اور سکنڈری سطح پر اردو تعلیم کی راہ ہموار کرنے کے لیے ضروری دباؤ ڈالنا تو درکنار اس کی بات بھی کبھی نہیں اٹھائی۔ حکومت بہ خوشی یونیورسٹی سطح کی تعلیم کے لیے آسانیاں دیتی رہی اور ابھی بھی مزید مراعات دے سکتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے یہاں یونیورسٹی سطح کی تعلیم پاکستان سے بہتر ہو جائے یا تمام دنیا سے بہتر ہو جائے مگر ایسی تمام مثالیں سیاسی بازیگری کے سوا کسی اور زمرے میں نہیں آسکتیں۔ یونیورسٹی سطح پر اردو کی تعلیم کی سہولتوں کی بات کرنا یا سرکاری اردو اداروں کی کارکردگی اور ان کے تئیں حکومت کی فراخ دلی کا ڈھنڈورا پیٹنے کا مقصد اردو والوں کی توجہ اردو کی تعلیم کے دو نکاتی مگر بنیادی نکتوں سے ہٹانے کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور اردو تحریک نیز اردو والوں نے اسے دو چار ہزار ملازمتوں کے سوال تک محدود کرکے چھوڑ دیا۔]

حکومت کی تعلیمی ذمّے داری اب یہ کہنے سے بھی کام نہیں چلے گا کہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلانے کے لیے اردو والے خود انتظام کریں اور رضاکارانہ طور پر ایسے اداروں کا قیام عمل میں لائیں جو ان کے بچوں کو اردو کی تعلیم دے سکیں۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر مگر غریب ملک اور پسماندہ معاشرے میں عوام کو تعلیم کی سہولیات فراہم کرنے کا کام حکومت کا ہے اور سپریم کورٹ کے ایک معرکتہ الآرا فیصلے کے بعد تو اب ہماری حکومت اس بات کے لیے پابند ہے کہ وہ ہر بچے کے لیے 14 برس کی عمر تک لازمی تعلیم کا نظم آئین کے Directive Principle of State policy کے تحت مگر بطور بنیادی حق کرے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اردو والے اپنے بچوں کو ریاستی نظام کے تحت ان کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دلانے اور اس کے علاوہ مادری زبان بحیثیت ایک لازمی مضمون کے پڑھنے کے حق سے محروم رہیں۔ یہ مسئلہ ہر ریاست کی اقلیتی زبانوں کو درپیش ہے مگر سندھی اور اردو کے سوا تمام قومی زبانیں اپنے مخصوص علاقوں میں جہاں ان زبانوں کے بولنے والوں کی اکثریت ہے نہ صرف یہ کہ مقتدر زبانیں سمجھی جاتی ہیں بلکہ حکومتی اور انتظامی معاملات میں بھی فیصلہ کن حد تک دخیل ہوتی ہیں۔ بے چاری اردو اور سندھی ایسی زبانیں ہیں جن کا کوئی گھر دوار نہیں ہے۔ وہ اپنے وطن میں بھی بے وطن ہیں۔ ثانوی سطح پر دوسری یا تیسری زبان کے طور پر اردو کی تعلیم کسی طالب علم میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کرسکتی کہ وہ یونیورسٹی کی سطح پر اردو ادب کا مطالعہ کرسکے۔ نہ اردو مادری زبان والے بچّوں کے ذہن کی تخلیقی صلاحیت کو جلا دے سکتی ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر اردو تعلیم کی کم معیاری اور کم صلاحیت یونی ورسٹی اردو اساتذہ، جن کے لیے اب 'جہلا کی چوتھی نسل' کی اصطلاح عام ہو چکی ہے، حکومت کی اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ بہرحال یونی ورسٹی سطح پر اردو کی تعلیم اردو کو زندہ رکھنے میں اپنی

حدود کے اندر ہی معاون ہو سکتی ہے۔ موجودہ صورت میں یونی ورسٹی کی تعلیم اردو تعلیم کے فروغ میں بری طرح حارج ہو گئی ہے۔ اگر بنیاد مضبوط ہو تو اس پر عمارت آج نہیں تو کل بن ہی جائے گی اور اردو کی بنیاد ابتدائی تا ثانوی سطح تک کا نظام تعلیم ہے۔

موجودہ حالات میں اردو کے فروغ کے لیے اس وقت سوال اعلا معیاری ادب کا ہے ہی نہیں اور نہ ہی تحقیق و تنقید اور مستند ادبی تاریخ کا ہے۔ یہ بھی ہوں تو اچھا ہے مگر اردو میں بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے پاس لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہمارے کسی کام نہ آئے گا اور نہ اردو میں پی ایچ ڈی کرنے والے اردو کے تباہ شدہ نظام تعلیم کو بحال کر سکیں گے۔

[اردو کے تمام تعلیمی مسائل کا حل یہی ہے کہ پرائمری سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم ہو اور اس کے بعد اردو ہائی اسکول میں مادری زبان یعنی پہلی اور لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے مگر یہی وہ حل ہے جس کے بارے میں ارباب اقتدار سوچنا ہی نہیں چاہتے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ **جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے اور جنھیں خود تمام تعلیمی اصولوں اور حکومت کے وضع کردہ ضابطوں کے مطابق اس زبان کو پہلی زبان کے طور پر پڑھنے کا حق ملنا چاہیے، انھیں یہ حق دوسری زبان کے طور پر بھی خصوصاً اتر پردیش اور عموماً شمالی ہند کے ان دیگر علاقوں میں نہیں مل سکا ہے جہاں اردو مادری زبان والوں کی اکثریت رہتی ہے۔** یہ ایسا زہر ہے جس کا تریاق کسی حکیم کے پاس نہیں۔ اور اب تو صورت یہ حال ہو گئی ہے کہ سنسکرت دوسری زبان کی جگہ لے لیتی ہے اور اردو سہ لسانی فارمولے سے یکسر خارج ہو جاتی ہے۔]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس وقت اردو کے تعلیمی نظام پر جو لوگ لکھ رہے ہیں ان میں سے اکثر کا ذہن اس موضوع پر صاف نہیں ہے۔ اردو والوں کو ابتدائی سطح پر ذریعۂ تعلیم اور ثانوی سطح پر فقط تعلیم کا حق مانگنا چاہیے اور یہ حق جمہوری طریقوں سے لڑ کر لینا چاہیے۔ شمال کی ریاستوں میں عرصے سے ریاست کی اکثریتی زبان کے سوا تمام دوسری اقلیتی زبانوں کو marginalize کرنے کی ایک مہم چل رہی ہے۔ مثلاً دہلی میں ہندی، سنسکرت، انگریزی اگر ابتدائی سطح پر رائج کی گئیں تو اردو یا پنجابی کے لیے یا یہاں کے تامل اور بنگلہ بولنے والوں کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں رہ جائے گی۔

جنوبی ہندستان میں غیر ہندی اقلیتوں کا معاملہ اور بھی نازک ہے۔ وہاں مقامی زبان، ہندی اور انگریزی کے بعد کوئی جگہ نہیں بچتی۔ اس لیے ہمیں ان ریاستوں میں ہندی کی جگہ ہندی۔ اردو مشترک کورس کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی جو اسکول کی سطح تک بہت مشکل نہیں ہے۔

آج جب ہماری نئی پود اردو سے نا آشنا ہوتی جا رہی ہے تو پھر اردو کتابیں، اخبارات کون پڑھے گا؟ مقتدر زبان، زندگی کے ہر پہلو پر۔ روزگار پر، تجارت پر، حکومت پر۔ غالب آجاتی ہے اور پھر ہر شخص جس کا تعلق لسانی اقلیت سے ہوتا ہے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتا ہے کہ اس کی زبان Ethnic Language یا گھر کی زبان یا مجلسی زبان بن کر رہ جائے لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا کہ بعد میں آنے والی نسلوں کا Culture Assimilation یہ ہو جائے گا کہ ان کو اپنی زبان سے اتنی بھی دلچسپی نہیں رہے گی۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اردو کے ہمدردوں نے کبھی اس بنیادی مسئلے پر غور نہیں کیا اور صرف حکومت کے مختلف محکموں سے سہولتیں مانگتے رہے یا فرضی اخبارات کے لیے اشتہارات۔ ابتدائی تعلیم کے ذریعے اور سہ لسانی فارمولے میں مادری زبان کی جگہ پر کبھی زور دیا ہی نہیں گیا۔

ایک نئے دور کا آغاز ہے، ہر بچے کو پڑھنے کا موقعہ ملے گا۔ ضرورت ہے کہ اردو بولنے والے بچوں کی ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعے ہو اور کم از کم دسویں تک، اور ممکن ہو تو بارہویں تک ان کو اردو بحیثیت لازمی زبان کے پڑھنے کا بلا شرط موقع ملے۔ **ضرورت اور اوّلین ضرورت اگر کسی بات کی ہے تو وہ یہی ہے کہ اردو مادری زبان والے طلبہ کو بغیر کسی عددی شرط کے آئین کی ہدایت کے مطابق اردو میں پرائمری تعلیم اور ثانوی سطح پر سہ لسانی فارمولے میں پہلی اور لازمی زبان کے طور پر اردو کے پڑھنے کا موقع ملے۔** مگر ان زبانوں کو جو ہندستان کی مختلف ریاستوں میں لسانی اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن میں اردو اپنی آبادی کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے، ابھی ان کا حق ملنا باقی ہے اور جب تک ہر ریاست میں لسانی اقلیت کو تعلیمی نظام، انتظامی امور، سرکاری عوامی ذرائع ترسیل میں یکساں بنیادوں پر تسلیم نہیں کیا جائے گا تب تک ہمارا جمہوری نظام خود کو صحیح معنوں میں جمہوری کہلانے کا حق دار نہ بن سکے گا۔

(ترجمہ: مشتاق صدف)

Syed Shahabuddin
Flat No.404, Block-8
East End Apartments,
Mayur Vihar-1 Extension, Delhi-98

سیّد حامد

اردو میڈیم اسکول: کیفیت، مسائل اور تدابیر

اردو میڈیم اسکولوں کو ارباب فضیلت نگاہ تحقیر سے دیکھنے لگے ہیں۔ ان کا نام آتے ہی ان کی تیوری پر بل آجاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان اسکولوں کا معیار اچھا نہیں ہوتا، ان کے طالب علموں کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اردو میڈیم اسکولوں کی خستہ حالی اور تنگ معیاری کی وجہ کیا ہے۔ آیا وجہ اردو میڈیم ہے؟ کیا اردو زبان میں علوم سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے؟ کیا اردو زبان ذہن کو کند کر دیتی ہے؟ کیا جو لوگ اردو لکھتے پڑھتے ہیں ان میں سوچ بچار اور غور وخوض کی صلاحیت نہیں رہتی؟ کیا ان کا ذہن اپج اور ایجاد اور تخلیق کی طاقت سے محروم ہو جاتا ہے؟۔ ان میں سے کسی سوال کا جواب ہاں میں نہیں ہے۔

صورتِ حال پر گہری نظر ڈالیے تو اردو میڈیم اسکولوں کی تنگ معیاری کی دو وجوہ سامنے آئیں گی۔ (1) اردو میڈیم اسکول مسلمان ہی کھولتے اور چلاتے ہیں اور ان سے من حیث القوم ادارہ چلانے کی صلاحیت سلب ہو چکی ہے۔ انانے انھیں پھلا دیا ہے اور حسد نے انھیں پھونک دیا ہے۔ ان کے ادارے خانہ جنگی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں معیار اچھا کیسے ہو سکتا ہے؟ اردو میڈیم کو مورد الزام کیوں ٹھہرائیں؟ ہندی یا انگریزی میڈیم کے جو اسکول مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں ان میں سے بیشتر بدنظمی اور معیار فراموشی کے لیے بدنام ہیں۔ قصور میڈیم کا نہیں، انتظامیہ کا ہے۔

آپ کہیں گے تسلیم کہ مسلمانوں کے چلائے ہوئے دوسرے اسکول بھی اعلا معیاری کا ثبوت نہیں دیتے لیکن وہ بالعموم اردو میڈیم اسکولوں سے بہ حیثیت معیار کے بہتر ہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ خوشحال ماں باپ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں داخل کرنے سے کتراتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بچے اردو میڈیم سے تعلیم پائیں گے تو کیا خاک روزگار تک ان کے ہاتھ پہنچ ہی نہ پائیں گے۔ والدین کیا کریں اور کیا نہ کریں یہ بعد کی بات ہے۔ یہاں یہ تو ثابت ہو گیا کہ اردو اسکولوں کے معیار میں جو گراوٹ آئی ہے اس کے لیے وہ خوشحال ماں باپ بھی ذمے دار ہیں جو ان اسکولوں میں اپنے بچوں کو داخل نہیں کرتے۔ یاد رہے کہ خوشحال گھروں میں عام طور پر باخبری کا ماحول پایا جاتا ہے اور ان کے بچوں کے ذہنوں پر گھر کے ماحول کے تحت بچپن ہی سے صیقل ہونا شروع ہو جاتی ہے جس سے عام طور پر غریب گھروں کے بچے محروم رہتے ہیں۔ ہے تا یہ انوکھی بات کہ لائق بچوں کو اردو اسکول بھیجا ہی نہ جائے اور پھر اسکول والوں کو الزام دیا جائے کہ یہ معیار کو اونچا کیوں نہیں رکھتے؟۔

در میانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(تم نے مجھے تختے سے باندھ کر سمندر کی تہ میں ڈال دیا ہے اور حکم یہ دے رہے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہونے پائے)

اردو اسکولوں کی پست معیاری اور بدحالی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ارباب تعلیم اردو کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ نصاب کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں یا دیر سے دستیاب ہوتی ہیں۔ ایسے افراد بھی جو اردو میں لکھے ہوئے جوابات کو ڈھنگ سے جانچ سکیں، یعنی جنھیں مضمون اور میڈیم دونوں پر عبور ہو، مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ اردو میڈیم لینے والے طلبہ کم ہوتے ہیں اس لیے بعض اوقات اردو میڈیم میں پرچے ٹھیک سے چھپ نہیں پاتے، اردو میڈیم سے پڑھنے اور امتحان دینے کے لیے طالب علم اگر بڑی تعداد میں آنے لگیں تو پرچوں اور کتابوں کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔

اردو میڈیم کے اسکول مہاراشٹر، کرناٹک اور بہار میں بڑی تعداد میں ہیں، اور ایک حد تک آندھرا پردیش میں بھی۔ بہار کو چھوڑ کر اس علاقے میں جسے ہندی بیلٹ کہا جاتا ہے اردو میڈیم اسکولوں کا قحط ہے۔ اردو پر سب سے کاری وار اتر پردیش میں کیا گیا۔ چنانچہ وہاں اردو میڈیم اسکول کا وجود عدم کے برابر ہے۔ بہر کیف اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پہلا ضروری قدم یہ ہوگا کہ مختلف ریاستوں میں (1) اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد (2) ریاستی حکومت کی پالیسی اور (3) ان اسکولوں کے مسائل پر روداد کیفیت (Status Report) تیار کی جائے۔ بعض مسائل مشترک ہیں اور

● **یہ مضمون قومی اردو کونسل کے سیمنار "اردو زبان وتعلیم کے فروغ کا ایجنڈا" منعقدہ 18 تا 20/نومبر 1999، میں پیش کیا گیا۔**

بعض مختلف۔ مناسب ہوگا اگر کونسل برائے فروغ اردو یہ معلومات فراہم کرنے کا اہتمام کرے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد اور معیار کی بابت معلومات حاصل نہیں کرسکا۔ عام تاثر البتہ ان اسکولوں کے متعلق تنگ معیاری کا ہے۔ نمونے کے طور پر دہلی کے سرکاری اردو اسکولوں کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

اسکول کا نام	فیصد کامیابی	اسکول کا نام	فیصد کامیابی
گورنمنٹ گرلز لال کنواں	10	جامع مسجد اسکول۔1	11
جامع مسجد۔2	4	سروودے گرلز جامع مسجد۔1	10
سروودے گرلز جامع مسجد۔2	74	گورنمنٹ گرلز بلبلی خانہ	13
سروودے گرلز زینت محل	28	گورنمنٹ گرلز حویلی اعظم خاں	24
گورنمنٹ گرلز چشمہ بلڈنگ	11	گرلز سکنڈری نیا محل	14
گورنمنٹ بوائز سکنڈری پنودی ہاؤس	46		
نیا محل	14	کلاں محل گرلز سکنڈری	25

مہاراشٹر کے اردو میڈیم اسکولوں کے بارے میں پروفیسر اکبر رحمانی نے "ہماری زبان" (8/نومبر 99ء) میں تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مہاراشٹر میں لسانی تعصب بہت کم ہے اور وہاں کے ہندو عوام نے بھی اردو کو مراٹھی زبان کا حریف نہیں سمجھا۔ ہر چند کہ مہاراشٹر آر۔ ایس۔ ایس اور شیوسینا کا گڑھ ہے، وہاں اردو تعلیم کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی گئی۔ آج بھی پرائمری، سیکنڈری اور ہائر سکنڈری اسکولس قائم ہو رہے ہیں اور حکومت نہ صرف انھیں مانیتا دیتی ہے بلکہ گرانٹ (مالی امداد) بھی۔ پروفیسر رحمانی کی رائے میں مہاراشٹر کا ماحول ترقی پسندانہ اور سیکولر ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، مہاراشٹر اور یوپی کی حکومتوں کے رویے میں آسمان زمین کا فرق رہا ہے۔ یہ بات بھی انوکھی سی ہے کہ یوپی میں ایک عرصۂ دراز تک ایک ایسی پارٹی کی حکومت رہی ہے جو خود کو سیکولر کہتی ہے اور اردو کے ساتھ جتنی ناانصافی ہو سکتی تھی ہوتی رہی اور مہاراشٹر میں کانگریسی حکومت نے زبان کے متعلق جو روش اپنائی تھی وہی روش دو غیر سیکولر پارٹیوں کی مشترکہ حکومت نے قائم رکھی۔ انھوں نے سید والا گہر کا یہ قول نقل کیا ہے:

"یہ بات ہندستان کے سب سے اونچے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر بطور یادگار لکھ دی جائے کہ ایک قوم اسی صورت میں ترقی کر سکتی ہے جب کہ اسے اس کی زبان (یعنی مادری زبان) میں تعلیم دی جائے"۔ مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے تو بچوں میں غور و فکر کی صلاحیت کو فروغ ہوتا ہے اور تخلیقی طاقت کو نشو و نما ملتی ہے۔ اجنبی زبان تخیل اور تخلیق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کے پھولنے پھلنے کا رشتہ دو سرچشموں سے جوڑا ہے۔ ایک تو حکومت کی روشن خیالی دوسرے مہاراشٹر کے مسلمانوں کی اردو سے محبت اور اس کی بقا اور فروغ کے لیے جد و جہد۔ عام اردو میڈیم اسکولوں کے علاوہ اردو میڈیم کے پرائمری ٹیچرز ٹریننگ کالج ہر ضلع میں کھولے جا رہے ہیں۔ اسی طرح سکنڈری ٹیچرس ٹریننگ کالج بھی جو "بی ایڈ" کی سند دیتے ہیں، کھل رہے ہیں۔ الغرض اردو میڈیم اسکولوں کی بدولت ہزاروں افراد کو روزگار مل رہا ہے اور لاکھوں طالب علم اردو سیکھ رہے ہیں۔ اسی لیے کتابیں بھی خریدی جاتی ہیں اور اخبار اور رسالے بھی لیکن وہاں بھی خود اردو والوں کی بے توجہی اور اردو اساتذہ کی خود غرضی اور بے حسی کی وجہ سے اردو اور اردو میڈیم اسکولوں کو خطرہ درپیش ہے۔ وہ والدین جنھیں استطاعت ہے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں داخل کرانے کے بجائے پبلک اسکولوں میں داخل کرتے ہیں۔ یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ حالاں کہ مہاراشٹر میں گذشتہ تین سال متواتر اردو میڈیم کے طالب علموں نے بورڈ کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس مثال سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ اردو میڈیم اسکولوں کا معیار بہتر ہو گیا ہے لیکن یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ کسب فضیلت اور حصول امتیاز کے لیے اردو میڈیم سد راہ نہیں ہوتا۔ اگر اساتذہ دلچسپی لیں اور محنت کریں تو جو دھبّہ ناحق اردو میڈیم اسکولوں پر لگایا گیا ہے وہ چھوٹ سکتا ہے۔

غالباً مذکورہ بالا صورت حالات کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھوا کر بچوں کے مستقبل کو خطرے میں کیوں ڈالا جائے۔ اردو کو بہ حیثیت مضمون کے پڑھنے دیا جائے تو بھی کام چل جائے گا اور اردو بھی محفوظ رہے گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نفسیات لسانی کمتری کی ہے۔ ایک بار پسپائی اختیار کرلی تو پھر کہیں روک نہ لگ سکے گی۔ پھر اردو وہیں پہنچ جائے گی جہاں عصمت چغتائی اور معصوم رضا راہی اور سنگھ پریوار اسے لے جانا چاہتا ہے یعنی اردو رسم خط کے بجائے ناگری لپی اختیار کرلی جائے۔ دستور فنا کا اتمام اس وقت ہوگا جب یہ زبان اپنا نام بھی ترک کردے گی جیسے اردو فلموں کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ کیا آپ اسے اندھیر نگری نہیں کہیے گا کہ ایک طرف اردو میڈیم اسکول دم توڑنے لگیں اور دوسری طرف اعلا تعلیم کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کی شکل میں ایک بڑا ادارہ قائم کیا جائے۔ یہ بات بھی شاید واضح ہو چکی ہے کہ اگر

اردو میڈیم سے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہو گئی تو پھر ان کے لیے کتابیں چھپوانے میں سخت دشواری ہو گی۔

اردو والوں کو کھلی آنکھوں کے ساتھ یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے ہمیں اردو میڈیم اسکولوں کو برقرار رکھنا چاہیے۔ ان کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیے اور ان کے معیار کو بہتری کی طرف لے جانا چاہیے۔ ایک دفعہ یہ فیصلہ کر لیا گیا تو اس میں جان ڈالنے کے لیے بہت سے اقدامات کرنے پڑیں گے۔

اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھانے کے خلاف عام طور پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ جو طلبہ ان اسکولوں سے نکلتے ہیں انھیں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں تدریس و تحریر کا ذریعہ انگریزی ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کی انگریزی مضبوط کرنے کا خاص انتظام کیا جائے۔ ان اسکولوں کی منتظمہ کو اپنے وسائل سے اسکول کے عام اوقات کے باہر انگریزی پڑھانے اور لکھوانے کا خاص انتظام کرنا چاہیے تاکہ ان کے طلبہ کو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو بالخصوص اور انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخوں اور اردو اکادمیوں کو بالعموم اردو اسکولوں میں انگریزی کی اضافی تعلیم کے لیے اہتمام کرنا ہوگا۔

اس بات کو تو ریاستی حکومتوں نے تسلیم کیا ہے کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں ہی ہونا چاہیے۔ اردو والوں کو اب اس پر بھی اصرار کرنا چاہیے کہ ثانوی تعلیم بھی اردو میں دی جائے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے مبصرین کا یہ کہنا ہے کہ اس کے سیلاب میں بہت سی زبانیں بہہ جائیں گی۔ گویا اردو کو نہ صرف مقامی زبانوں کی یورش کی مدافعت کرنی ہے بلکہ اکیسویں صدی کے لسانی خطرات کا مقابلہ بھی کرنا پڑے گا۔ ان خطرات کی نوعیت کیا ہوگی اس کی کھوج لگانا اور تدارک کی تدابیر کرنا بھی آنے والے زمانے کا تقاضہ ہے۔

اردو میڈیم کے خیر خواہوں کو یہ بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ حکومت وقت سے منظم اور مدلل طریق پر تقاضے کرنے کے علاوہ جن کے نتائج کے متعلق کوئی یقین نہیں، گھروں پر اردو پڑھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ زبان کی بنیاد بچپن میں ہی پڑتی ہے۔ اگر گھر پر جتن کر کے اردو کی تعلیم دی گئی تو نہ صرف یہ کہ ہندی اور انگریزی زبانیں سیکھنے میں مدد ملے گی بلکہ اردو میڈیم اسکولوں کا معیار خود بخود بہتر ہو جائے گا۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ اردو والے اردو اور اردو میڈیم کو بچانے اور فروغ دینے کے لیے زبانی جمع خرچ کے حصار سے نکلتے اور ایثار اور جدوجہد کے لیے تیار ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اردو کے لیے امیدیں باندھنا بے سود ہوگا۔ حکومت سے کہیں زیادہ کوششیں اردو والوں پر واجب ہیں۔ حکومت کا جہاں تک تعلق ہے اردو اکادمیوں کو مناسب ہدایات دینے کے علاوہ وہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، آندھرا پردیش یونیورسٹی نیشنل اوپن اسکول دہلی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ایک اجتماعی اور ہمہ گیر کوشش پر آمادہ کر سکتی ہے۔ خود مولانا آزاد یونیورسٹی سے ملحق ایک اوپن اردو ہائی اسکول ہونا چاہیے۔ حکومت کو لازم ہے کہ اردو بولنے والی ریاستوں میں اردو میڈیم کا ایک ماڈل پبلک اسکول کھولے۔

جن اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے ان کو مؤخر کیے بغیر پانچ ریاستوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت اردو میڈیم اسکولوں کا سروے کرایا جائے اور سروے کے نتائج کو عام کیا جائے اور ان کی بنیاد پر اصلاحی قدم اٹھائے جائیں۔

Chancellor
Jamia Hamdard
Talimabad, Sangam Vihar
New Delhi-62

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلیٰ درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ کے لیے خصوصی رعایت

پتا: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

حفیظ اللہ نیولپوری

اڑیسہ میں اردو کی صورتِ حال

اڑیسہ میں اردو زبان کا آغاز فیروز شاہ تغلق کے زمانے سے ہوا، جب کہ ان کی فوج جاج پور تک آچکی تھی۔ چار صدیوں سے کچھ زیادہ 1510ء کے آس پاس بنگال کے حکمراں حسین شاہ کے سپہ سالار اسماعیل غازی کے اڑیسہ پر حملہ آور ہونے تک اس سرزمین میں اردو کا سوتا بہتا رہا۔ علاوہ ازیں اس علاقے میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں صوفیائے کرام کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔ اڑیسہ میں جو مسلمان آئے ان کی تہذیبی زبان فارسی تھی۔ فارسی نے یہاں سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت اختیار کرلی تھی، چنانچہ وہ یہاں کی مقامی زبان "اڑیا" کو بھی متاثر کرتی رہی۔ جو لوگ فاتحوں کے ساتھ باہر سے اڑیسہ آئے ان میں سے اکثر نے اسے اپنا وطن بنالیا۔ نتیجے کے طور پر ایک لسانی اور تہذیبی سمجھوتا عمل میں آیا۔ اڑیسہ میں فارسی اگرچہ سرکاری اور دفتری زبان تھی لیکن اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو لوگوں کے درمیان رابطے کی زبان بنی اور رفتہ رفتہ قومی تہذیب کی ترجمان بھی۔

1592ء میں مغلوں نے شمالی اڑیسہ پر قبضہ کرلیا اور اسی دوران دکن کی جانب سے گولکنڈہ کے سلطان نے اڑیسہ میں چلکا کے کنارے تک کا حصہ اپنے قبضے میں کرلیا۔ بیک وقت شمال اور جنوب کی جانب سے دو مختلف سیاسی اقتدار کی توسیع نے اڑیسہ میں اردو زبان کے ارتقا میں خاصا رول ادا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اڑیسہ کے مقامی لوگوں میں جن کی مادری زبان "اڑیا" تھی اردو اور فارسی مقبول ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ برج ناتھ بڑجینا، فقیر موہن سیناپتی اور گوپال چندر پرہراج نے اپنی اڑیا ادبی تخلیقات میں اردو الفاظ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ بعد میں تو اردو، فارسی الفاظ اڑیا زبان کا جزو لاینفک بن گئے اور آج اڑیا لغات میں دو ہزار سے زائد اردو فارسی اور عربی الفاظ نے اپنا مستقل مقام بنالیا ہے۔ ان کے علاوہ آج تک اڑیسہ کی کچہریوں اور عدالتوں میں جو محرر قبالے اور دستاویزات اڑیا زبان میں لکھتے ہیں ان پر بھی اردو اور فارسی الفاظ حاوی ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اڑیا رسم خط میں "کرنی" طرز تحریر بھی فارسی کے خطِ شکستہ کے زیر اثر وجود میں آیا۔

اٹھارہویں صدی میں جب شجاع الدین محمد خاں اڑیسہ کا صوبے دار تھا، اڑیسہ میں "ستیہ پیر" کی پوجا کا آغاز ہوا۔ یہ پوجا ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے نظریے سے فروغ پذیر ہوئی۔ اس ضمن میں بہت سی ادبی تخلیقات بھی وجود میں آئیں، جنھیں اڑیسہ میں "پالا" کہا جاتا ہے۔ مغل اور افغان کلچر اور اردو زبان کا اڑیسہ کے ہندو کلچر پر جو گہرا اثر پڑا اس کی زندہ مثال اڑیا زبان کے "پالا" یا "جاترا" میں نظر آتی ہے۔ دراصل "ستیہ پیر" کی پوجا کا یہ سلسلہ ایک قطعی غیر فرقہ وارانہ دینی رسم اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھا۔ اڑیسہ کے رسم و رواج، وضع قطع، خورد و نوش اور طرزِ معیشت کی بات کی جائے تو قدم قدم پر اردو ثقافت کے اثرات چھپے ہوئے ملتے ہیں۔

مغلیہ دورِ حکومت میں شہر کٹک کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ یہی اڑیسہ کا دارالسلطنت تھا۔ بیرونی علما و فضلا کا مسلسل یہاں ورود ہوتا رہا۔ اڑیسہ کے مختلف علاقوں میں صوفیائے کرام کی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جہاں ایک طرف دہلی، پنجاب، اترپردیش، بہار اور بنگال سے معیاری اردو زبان براہِ راست یہاں پہنچی، وہیں آندھرا کی طرف سے دکنی اردو بھی یہاں آئی۔ اڑیسہ کے جنوبی علاقوں میں یعنی گنجام اور کوراپٹ ضلعوں میں اب بھی دکنی اردو رائج ہے لیکن دیگر شہری اضلاع میں جو اردو بولی جاتی ہے وہ معیاری اردو اور دکنی اردو کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔

دورِ قدیم سے اڑیسہ ایک دور افتادہ اور سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے ایک زبوں حال صوبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ انگریزوں کی حکومت سے قبل یہاں باقاعدہ تعلیم کا رواج عام نہ تھا۔ 1803ء میں انگریزوں کی آمد کے بعد اڑیسہ میں سیاسی اور سماجی حالات بدلنے لگے۔ جنوبی اڑیسہ کے مقابلے میں شمالی اڑیسہ میں تعلیمی صورتِ حال کسی حد تک مختلف تھی۔ 1858ء میں شمالی اڑیسہ میں صرف 30 اسکول تھے۔ 1870ء میں ان کی تعداد بڑھ کر 95 ہوگئی۔ اسی دوران کیندراپاڑہ، پوری، بھدرک اور بالیسر کے ہائی اسکولوں میں اردو تعلیم کا آغاز ہوا۔ بھدرک کی تقریباً ساٹھ فی صد آبادی اردو بولنے والوں پر مشتمل تھی اور وہاں اردو زبان کے اثرات مقامی اڑیا زبان پر حاوی تھے۔ عرصۂ دراز سے بنسی ولبھ گوسوامی کا Folk Drama "مغل تماشا" وہاں کے عوام میں خاصا مقبول تھا جو بعض محققین کی نظر میں اردو کا اولین ڈراما سمجھا جاتا ہے (زمانۂ تصنیف 1800ء)۔ اگرچہ اڑیسہ میں اردو بولنے

والوں کی تعداد مجموعی آبادی کی محض دو فی صد ہے لیکن تعلیم کے ضمن میں وہ دوسروں کے مقابلے میں پس ماندہ نہیں ہیں۔ آبادی کے تناسب سے اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ہمیشہ بہتر رہی ہے۔

اڑیسہ میں اردو ادب کا قابلِ اعتنا سرمایہ موجود ہے۔ اردو شاعری کی بات کی جائے تو ہر دے رام جودت، مولوی سلطان راجی، امین اللہ حرقی، عبدالمجید بھونیاں حیا، مجرم سنبلپوری، معلم سنبلپوری، منشی عبدالرحیم احسن، محمد محسن محسن، انور علی انور، عبدالعزیز عاشق، مولا بخش مولا، مولوی رحمت علی رحمت، امجد نجمی، سعید اختر، حیدر نایاب، محبوب محشر، کرامت علی کرامت، عبدالمجید فیضی، خالد رحیم، شکیل دسنوی، یوسف جمال، رشمی کانت راہی، اطہر عزیز، ساجد اثر، اجمل نقشبندی، سعید رحمانی، اسماعیل آذر، سید اولاد رسول قدسی، عبدالمتین جامی، عبدالحق بیتاب، خاور نقیب، قطب کامران، حسن سعید وغیرہ شعرا کا ایک طویل کاروانِ اردو کی شعری روایات کی پیش رفت میں فعال نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ بیرونِ اڑیسہ کے جو اصحاب قلم یہاں کے کاروانِ ادب میں پیش پیش رہے ہیں ان کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں قدرت اللہ شہاب، شمس منیری، اصغر علی بیدل، سید منظر حسن دسنوی، پروفیسر شکیل الرحمن، مظہر امام، اوج اعظمی، فرحت زیدی، سیلانی سیوتے، خالد شفائی، عزیز جالندھری، ذی این شر ماسوز وغیرہ کی غیر معمولی ادبی خدمات کو تعظیم و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اقبالیات پر شیخ حسیب اللہ کے مضامین نے اردو دنیا سے اڑیسہ کا ناطہ جوڑا، پھر بھی اردو شاعری کے مقابلے میں یہاں نثری تخلیقات کا سرمایہ نسبتاً کم ہے سب سے قدیم نثری تصنیف مولوی محمد سلطان راجی کی ہے۔ ان کی نثری تخلیقات میں اپنے عہد کی ادبی زبان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ مولوی رحمت علی کی نثری تصنیف "رفیق العقل" اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقا کی اہم کڑی ہے۔ ان کے علاوہ مولوی عبدالرشید نقاد کے انشائیے، امجد نجمی کے ڈرامے، پنڈت لکشمی نرائن مصرا کی "بھگوت گیتا اور اسلام"، کرامت علی کرامت اور یوسف جمال کے تنقیدی مضامین، راقم السطور کے تحقیقی مضامین، سعید رحمانی اور عبدالمتین جامی کی صحافت، محمود بالیسری کے افسانے، نسیمہ بیگم کے تراجم فراموش نہیں کیے جاسکتے۔

اڑیسہ میں اردو صحافت کی تاریخ محض نصف صدی پر محیط ہے۔ اردو صحافت کے ارتقا میں ہفت روزہ "مسلم گزٹ"، "دورِ جدید"، "بیداری"، "صدائے اڑیسہ"، "سہارا"، ماہنامہ "المنصور"، "شاخسار"، "فروغِ ادب"، "نئی شناخت"، "ترویج" اور روزنامہ "آج تک" کٹک نے اڑیسہ میں اردو کے فروغ میں خاصا اہم رول ادا کیا ہے۔ ترویج نے اپنے مختصر عرصۂ اشاعت میں متعدد خاص نمبر شائع کیے اور ملک کے موقر ادبی رسائل کی صف میں اپنی شناخت قائم کی۔ اس سے قبل یہ سعادت ماہنامہ "شاخسار" کو حاصل ہو چکی ہے۔ شاخسار کی اشاعت نے اس عہد میں اردو تحریک کی پیش رفت میں اہم حصہ ادا کیا تھا جس کی وجہ سے "شاخسار کی ادبی خدمات" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر اُتکل یونیورسٹی نے سلمان راغب کو 1992ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔

سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اڑیسہ میں اردو تدریس کا تشفی بخش انتظام ہے۔ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن سے ملحقہ اسکول، اڑیسہ اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے تحت چلنے والے مدارس، کونسل آف ہائر سکنڈری ایجوکیشن کے تحت چلنے والے جونیئر کالجوں کے علاوہ اُتکل یونیورسٹی، سمبلپور یونیورسٹی اور فقیر موہن یونیورسٹی کے متعدد ملحقہ ڈگری کالجوں میں اردو ایم آئی ایل اور بطور اختیاری مضمون تدریس کی سہولتیں ہیں۔ فقیر موہن یونیورسٹی کے ملحقہ سرکاری کالج "بھدرک کالج" میں اردو کا پوسٹ گریجویٹ شعبہ بھی کام کر رہا ہے جس میں ایم اے پارٹ ون کے لیے سولہ اور پارٹ ٹو کے لیے سولہ امیدواروں کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ برہم پور یونیورسٹی اور نارتھ اڑیسہ یونیورسٹی میں اردو کے پرچوں میں امتحان دینے کی سہولت حاصل ہے، حالانکہ ان جامعات کے تحت کسی کالج میں اردو تدریس کا انتظام نہیں ہے۔

اڑیسہ کے اردو ادیبوں نے جادۂ تحقیق میں خال خال قدم رکھے ہیں، اس کے باوجود تحقیق کے اصول و ضوابط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اردو کا جو تحقیقاتی ادب ہمارے سامنے آیا ہے اس میں کرامت علی کرامت کا مضمون "محمد محسن" شیخ حسین اللہ کے مضامین "خاتم بہراج پوری"، "معلم سنبلپوری" اور "مغل تماشا" محمود بالیسری کا "فقیر موہن سیناپتی" اور راقم الحروف کے متعدد مضامین اڑیسہ میں اردو کے تحقیقاتی ادب کا اہم حصہ ہیں۔ اس سے قطع نظر راقم السطور نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے، نسیمہ بیگم نے اُتکل یونیورسٹی سے، سید مسیح اللہ نے رانچی یونیورسٹی سے، سید سراج الاسلام نے رانچی یونیورسٹی سے، شاہدہ شمیم بانو نے رانچی یونیورسٹی سے، عزیز الرحمن نے رانچی یونیورسٹی سے، سلمان راغب نے اُتکل یونیورسٹی سے، منور علی نے اُتکل یونیورسٹی سے، شیریں پروین نے اُتکل یونیورسٹی سے مختلف اہم موضوعات پر مقالے لکھ کر پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کی ہیں، اور اڑیسہ کے متعدد اسکالر مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔

اڑیسہ میں اردو کے ارتقا میں یہاں کے ادبی اور ثقافتی اداروں نے اہم کارنامے انجام دیے ہیں، جن میں سے چند اہم ادبی اور ثقافتی اداروں کا تعارف نا گزیر ہے:

(1) بزم ادب: کٹک میں اردو کی قدیم ترین ادبی انجمن جس کے زیر اہتمام بڑی پابندی سے شہر میں ماہانہ طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے اور بڑے پیمانے پر بھی چند مشاعرے منعقد ہوئے۔

(2) بزم سخن اڑیسہ: امجدؔ نجمی کی زیر صدارت یہ ایک نہایت فعال ادبی انجمن رہی ہے جس کے زیر اہتمام شہر کٹک میں کئی تاریخی آل انڈیا، مشاعرے منعقد ہوئے۔ ملک کے متعدد نامور شعرا نے ان مشاعروں میں شرکت کی۔ مشاعروں کے سونیئر شائع ہوئے۔ ان مشاعروں کے زیر اثر مضافاتی علاقوں میں بھی مشاعرے کی روایت چل پڑی۔

(3) اردو لائبریری آف اڑیسہ: اس لائبریری کے موسس حاجی معین الدین احمد (سکیدوش آئی اے ایس) ہیں۔ موصوف نے اس لائبریری کو ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہے۔

(4) مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن کٹک: صحیح معنوں میں شہر کٹک میں تہذیبی اور ثقافتی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس کے متعدد شعبے ہمہ وقت فلاحی اور تعمیری کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً سے اردو کی اہم ادبی سرگرمیوں کا سہرا MYCA کے سر جاتا ہے۔

(5) مجمی اکادمی: شہر کٹک کا ایک غیر سرکاری ادبی و ثقافتی موقر ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام مشاعرے، ادبی مذاکرے و قتاً فوقتاً ہوا کرتے ہیں اور مجموعی ادبی خدمات کی بنا پر ملک گیر پیمانے پر ادیبوں اور شاعروں کو "مجمی ایوارڈ" سے نوازا جاتا ہے۔ یہ اکادمی مجم الشعرا حضرت امجد مجمی کی یادگار ہے۔ اب تک شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام، حیدر نایاب، شیخ حبیب اللہ اور دیگر متعدد اصحاب قلم کو "مجمی ایوارڈ" سے نوازا گیا ہے۔

(6) اڑیسہ اردو اکادمی: اڑیسہ کے اردو دوستوں کی مسلسل تیرہ سال کی کدوکاوش کے نتیجے میں 1987ء میں حکومت اڑیسہ نے "اڑیسہ اردو اکادمی" قائم کی۔ اس کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ایک سہ ماہی ادبی جریدے "فروغ ادب" کی اشاعت، اڑیا کے منتخب بہترین افسانوں کے اردو ترجمے کی اشاعت، کرشن چندر کے ناولٹ "دروازہ کھول دو" کا اڑیا ترجمہ، اڑیا اردو ڈکشنری، اردو کے ادبی و ثقافتی اداروں کو مالی تعاون، اردو کے ضرورت مند قلم کاروں کو مالی تعاون، غیر اردو داں لوگوں کے لیے تعلیمی مراکز کا قیام، اردو میں امتیازی نشانات حاصل کرنے پر طلبہ و طالبات کو وظیفے، اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے قلم کاروں کو مالی تعاون، آل اڑیسہ مشاعرے، مذاکرے، شام غزل، قوالی، ملک گیر پیمانے پر مشاعرے، مذاکرے کے علاوہ مجموعی ادبی خدمات اور تخلیقات پر "اڑیسہ اردو اکادمی ایوارڈ" دیے جاتے ہیں جو دس ہزار روپے اور توصیفی اسناد پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(7) اڑیسہ اردو رائٹرز گلڈ: شہر کٹک میں اردو کا ایک فعال ادبی اور ثقافتی ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام اعلا پیمانے پر مشاعرے ہوا کرتے ہیں اور غیر اردو ماحول کے ابھرتے ہوئے اردو شاعروں کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں تحائف سے نوازا جاتا ہے۔

(8) گلشن ادب: ضلع کٹک کے مردم خیز قصبے سونگڑہ کا ایک قدیم ادبی و ثقافتی ادارہ ہے، جس نے وقتاً فوقتاً مشاعروں کے انعقاد سے قصباتی ماحول کو اردو ثقافت کی خوشبو سے معطر کر رکھا ہے۔

(9) بزم اردو: مغربی اڑیسہ کے Cosmopolitan City راؤرکیلا میں اردو تحریک کو سرگرم عمل رکھنے کے لیے اس بزم نے تاریخی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس کے زیر اہتمام اعلا پیمانے پر آل انڈیا مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

(10) بزم فیض و فراق: بھدرک کا ایک فعال ادبی و ثقافتی ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام ریاست اڑیسہ میں تاریخی مشاعرے منعقد ہوئے ہیں، جن میں اردو کے نامور شعرا نے شرکت کی۔

(11) فیضان ادب: شہر کٹک کا ایک فعال ادبی ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعرے اور اس کی ذیلی انجمن "بزم احباب" کے زیر اہتمام مذاکرے پابندی سے منعقد ہوا کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا ادبی اور ثقافتی اداروں کے علاوہ دیگر متعدد ادبی انجمنیں سرزمین اڑیسہ کے دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہیں، جن کے دم سے اردو کی سرگرمیاں جاری ہیں۔

اڑیسہ جیسے دور افتادہ علاقے میں اردو کتابت و طباعت کی سہولت کے فقدان کے باوجود دور قدیم میں اردو قلم کاروں نے اپنی نگارشات لکھنؤ، الہ آباد اور کلکتہ سے طبع کر کے شائع کروائیں لیکن دور حاضر میں یہاں کتابت، اردو DTP وغیرہ کی ساری سہولتیں مہیا ہیں اور اردو قلمکاروں کی تصنیفات اہتمام سے شائع ہو رہی ہیں۔

غیر اردو داں طبقے میں اردو کو مقبول عام کرنے میں، ماس میڈیا

کا اہم رول رہا ہے۔ بھدرک کے شاعر وڈراما نگار بنسی دلبھ گوسوامی کا "مغل تماشا" اس سلسلے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ "مغل تماشا" کو لوک ڈراما تسلیم کیا جائے تو یہ "گیتی ناٹیہ" یا "جاترا" کا ابتدائی روپ ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کی تصنیف ہے اور ایک ایسے شخص کی اردو تصنیف ہے، جس کی مادری زبان اردو نہ تھی۔ اس کے علاوہ "بھگوت گیتا اور اسلام" نامی کتاب اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کے مصنف پنڈت لکشمی نرائن مصرا نے جن کی مادری زبان اڑیا تھی، جیل میں اردو سیکھی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی صحبت نے انھیں علمی بصیرت سے اس طرح نوازا کہ ایسی مقتدر کتاب منصۂ شہود پر آسکی۔

اڑیسہ کی اردو شاعری میں قدامت کا سہرا ہر دے رام جودت کے سر جاتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ اس طرح چل نکلتا ہے کہ بھگت ہری رام کی رہائش گاہ پر مغلیہ دور کے اواخر میں "سکندر نامہ گنجوی" کا قلمی نسخہ تیار کیا جاتا ہے۔ اڑیا شاعر برج ناتھ بڑجینا ہوں یا رادھاناتھ رائے، فقیر موہن سیناپتی ہوں یا ان کے ہم عصر دوسرے اڑیا قلم کار، سب کی تخلیقات میں اردو کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اڑیا کی روز مرہ زبان میں اردو الفاظ اس طرح مدغم ہوگئے ہیں کہ ان کے مترادفات کا اڑیا میں پانا مشکل ہے۔ دوسری طرف ہمارے سامنے اڑیسہ کے چند ایسے اہلِ قلم حضرات کی تابندہ مثالیں موجود ہیں، جن کا تعلق اردو کے سماجیاتی ماحول سے نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی نگارشات اردو والوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر پرسو رام پرشاد کے حسنِ عقیدت میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کی نعت گوئی کے جذبے کو نمایاں کرتے ہیں۔

سبز گنبد کو نگاہوں میں بسایا میں نے
دل کو انوارِ محمد سے سجایا میں نے
آسرا آپ کی چوکھٹ کا ملا ہے جب سے
سر کسی در پہ نہ پرشاد جھکایا میں نے

شق ہوا جاتا ہے اے پرشاد خامے کا جگر
میں غم شبیر لاتا کس طرح تحریر میں

اردو شعر وادب میں پنڈت تلوک ناتھ انجم، رشمی کانت راہی، گوتم مترا، پپاشا ندرت، سریتا آبشار کے نام بھی معروف و مقبول ہیں۔

اردو غزل کے رومانی مزاج نے عصرِ حاضر کی ساری حیثیت اپنے دامن میں سمیٹ کر اس طرح پیش کی کہ رفتہ رفتہ غیر اردو داں گلوکاروں نے غزل گائیکی میں اپنا مقام بنالیا اور غزل غیر محسوس طور پر غیر اردو حلقوں میں دن بہ دن مقبول ہوتی گئی۔ اڑیسہ کے جن گلوکاروں نے اردو کے وسیلے سے مقبولیت حاصل کی ہے، ان میں پرنب پٹنایک، سوشری سنگیتا مہاپاترا، سبھاش داس، چترا مہاپاترا، سنگیتا مہاپاترا، سلگنا داس کے علاوہ دوسرے بہت سارے فن کار بھی شامل ہیں۔

"Ashiyana", Kesarpur,
Cuttack - 753001, Orissa

اُردو اِملا

رشید حسن خاں

- لفظوں کا صحیح املا کیا ہے؟
- اس کے اصول کیا ہیں؟ یہ بڑے اہم سوالات ہیں۔ اُردو میں ان پر انفرادی طور پر اور اُردو تنظیموں کی سطح پر غور کیا گیا ہے۔
- اس عہد میں رشید حسن خاں نے بے پناہ غور و فکر کے بعد اس علمی موضوع کا جائزہ لیا ہے۔
- 706 صفحوں کی اس کتاب 'اُردو املا' کا دوسرا ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے شائع کیا ہے۔

قیمت 135 روپے

آج ہی طلب کریں

صدر دفتر: قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔ ا، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 006

فون: 6103381, 6103938, 6179657 فیکس: 6108159

حیدر آباد شاخ: 5-4-435/20 قرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔500002

ڈاکٹر محمد ایوب خاں

اردو رسمِ خط کی جامعیت

کسی زبان پر کسی مذہب یا فرقے کی اجارہ داری کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ زبان کوئی بھی ہو وہ اسی کی ہے جو اسے بولتا ہے، سمجھتا ہے، لکھتا ہے اور پڑھتا ہے۔ علاقائی اثرات کی صداقت تسلیم کرتے ہوئے زبان کی تقسیم، علاقائی اعتبار سے کسی حد تک ممکن ہے لیکن اسے طبقاتی تناظر میں دیکھنا محض تعصب کے سوا کچھ نہیں۔ بدقسمتی سے یہ تعصب اردو زبان کے ساتھ برتا گیا، جس کی جڑیں فورٹ ولیم کالج سے پھوٹنی شروع ہوئیں۔ بظاہر اس کالج نے اردو کی بہت خدمت کی مگر اس ریاکاری کے منفی اثرات اور نتائج آج کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

وہ زبان جو کبھی ہندوی، کبھی ہندی، کبھی ہندستانی اور کبھی اردو کہلائی نیز جس میں امیر خسروؔ، قلی قطب شاہ، ولیؔ دکنی جیسے شعراء نے اپنی شاعرانہ جادو بیانی سے عوام کے ذہن و دل پر حکومت کی اور اپنے دیرپا اثرات مرتسم کیے، وہ زبان 1801ء کے بعد دو حصوں میں منقسم کردی گئی۔ اردو اور ہندی۔ اردو میں عربی، فارسی الفاظ اور رسم خط کو سامنے رکھا گیا اور ہندی کے لیے سنسکرت الفاظ اور دیوناگری رسم خط مختص کردیا گیا۔ خرابی یہ نہیں کہ ایک زبان سے دو زبانیں بنیں۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان قرار دے دی جاتی ہے۔ جبکہ دونوں زبانوں کی بنیاد ایک ہے اور گرامر کے اصول و قواعد ایک ہیں۔

یہ بات غور طلب ہے کہ آج بھی بولنے اور سمجھنے کی حد تک اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ فرق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اردو کے دعوے دار عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ اور ہندی کے شیدائی سنسکرت کے مشکل الفاظ سے اپنی زبان کو نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عربی، فارسی رسم خط والے دیوناگری حروف تہجی سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور دیوناگری رسم خط کے پرستار عربی، فارسی حروف تہجی کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اردو نے عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت، ہندی، پنجابی، انگریزی اور دوسری کئی زبانوں اور مقامی بولیوں کے اثرات قبول کیے اور ان کی آوازوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے جس سے اس زبان کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔

حروف تہجی وہ علامات ہیں جو مختلف آوازوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ حروف کو مخصوص ترتیب دینے سے الفاظ بنتے ہیں اور الفاظ کی ترکیب ذریعۂ اظہار بنتی ہے۔ جن حروف کو جس زبان نے اپنے الفاظ کے لیے اپنایا ہے وہ اس کے حروف تہجی ہیں اور یہی اس کا رسم خط ہے۔ ہم پہلے دیوناگری رسم خط کا جائزہ لیتے ہیں جو سنسکرت، ہندی اور بعض دوسری زبانوں میں مستعمل ہے۔ سنسکرت حروف تہجی۔

अ	इ	उ	ऋ	लृ	ए	ओ	ऐ	औ	
ا	اِ	اُ	رِ	لرِ	اے	او	اَے	اَو	
झ	भ	घ	ढ	ध	ज	ब	ग	ड	द
جھ	بھ	گھ	ڈھ	دھ	ج	ب	گ	ڈ	د
प	व	र	ल	ञ	म	ङ	ण	न	
پ	و	ر	ل	ن	م	ن	ڻ	ن	
ज	ट	त	क	प	श	ष	स	ह	
ڑ	ٹ	ت	ک	پ	ش	ش	س	ہ	
				ख	फ	छ	ठ	थ	
				کھ	ف	چھ	ٹھ	تھ	

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندی میں بعض حروف کے نیچے نقطے لگانے کا چلن غالباً اردو، فارسی اور عربی آوازوں کے زیر اثر ہوا اور ہندی میں مستعمل حروف تہجی سے ایسے حروف کو خارج کردیا جائے تو باقی بیالیس حروف خالص سنسکرت ہی کے رہ جاتے ہیں۔ ہندی میں سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ آوازیں ہیں جو اردو یا فارسی سے آئی ہیں اور ان آوازوں کو دیوناگری رسمِ خط میں بغیر اضافے کے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ف ذھ زھ ز غ خ آوازیں سنسکرت میں موجود نہیں البتہ ज्ञ त्र क्ष کا ہندی حروف میں اگر اضافہ نہ بھی ہوتا تو یہ کمی سنسکرت حروف سے ہی دور ہو سکتی تھی۔ مثال کے طور پر۔

ज + ञ = ज्ञ، त् + र = त्र، क् + ष = क्ष

ہندی میں خ غ ز ژ ڑھ ف حروف کی آوازیں تو پیدا ہو گئیں لیکن ث ح ذ ژ ص ض ط ظ ع ق ء کا نعم البدل نہیں آسکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی کے لوگ متذکرہ بالا حروف کے تلفظ میں الجھ جاتے ہیں اور ان حروف کی آوازوں کی صحیح ادائگی نہیں کرپاتے، جبکہ الفاظ کی غلط ادائگی سے عربی، فارسی الفاظ کے معنی بدلنے کا احتمال رہتا ہے۔

دیوناگری میں ष ہی ایک ایسا حرف ہے جس کا بدل اردو والوں نے پیدا نہیں کیا۔ اردو میں اگر भूषण, षटकोण, धनुष لکھنا چاہیں تو نہیں لکھا جاسکتا۔ لیکن جس طرح ن کی مدد سے ण کی آواز پیدا کی ہے اسی طرح ش کی تھوڑی بہت تبدیلی سے ष کی آواز پیدا کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ش کو श کے لیے اور ش کو ष کے لیے مختص کرکے اس مسئلے کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک اعراب کا مسئلہ ہے اردو میں ان سب آوازوں کے لیے اعراب موجود ہیں جو ہندی میں دیوناگری اعراب یا ماتراؤں سے نکالی جاتی ہیں۔ جہاں آدھی آواز یا ایک آواز کو دوسری میں مدغم کرنے یا ملانے کا سوال ہے اسے جزم (ْ) سے اور کسی حرف کی دوہری آواز کو تشدید (ّ) کی مدد سے ادا کرنے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اردو میں تنوین (ً ٍ ٌ) کا استعمال اس زبان میں مستعمل عربی حروف کو ہیئت اور معنی کے اعتبار سے ادا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ بعض ہندی داں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اردو رسم خط سے ہندی کے سہ حرفی الفاظ کی صحیح ادائگی میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ غور کریں تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر ہے تو اسے سکتہ (Comma) جیسی علامت کے استعمال سے دور کیا جاسکتا ہے۔

بیشتر یورپین زبانوں نے رومن رسم خط کو اپنایا ہوا ہے۔ لیکن یہاں صرف انھی حروف کو زیر بحث لانا کافی ہے جو انگریزی زبان میں استعمال ہوتے ہیں جیسے A B C D E F G H I J K L M N O P Q R S T U V W X Y Z مذکورہ حروف سے جتنی آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ سبھی اردو رسم خط میں موجود ہیں۔ جبکہ یہ خوبی کسی دوسری ہندستانی زبان کے رسم خط میں نہیں۔ مثال کے طور پر ایک لفظ ہے TELEVISION (ٹیلی ویژن) جو دیوناگری یا گورمکھی رسم خط میں صحیح نہیں لکھا جاسکتا کیونکہ 'ژ' کی آواز اردو کے سوا کسی دوسری ہندستانی زبان میں نہیں۔ اس لفظ کو عربی میں بھی ادا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ژ عربی زبان میں موجود نہیں، صرف فارسی میں ہے اور جہاں تک 'ٹ' کا سوال ہے یہ حرف عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود نہیں۔ کیا رومن حروف میں یہ قدرت ہے کہ اردو کی مانند اپنے اندر آوازوں کا سمندر سمو سکیں؟ اس سوال کے جواب میں یہاں بھی دیوناگری اور گورمکھی کی طرح مجبوری اور عاجزی کا احساس ہوتا ہے۔

یوں تو رومن حروف میں اردو، ہندی یا پنجابی لکھنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن جب لغت سازی میں یا ناموں میں یا اسی قسم کے دوسرے موقعوں پر یہ مسئلہ سامنے آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم خط بھی اردو آوازوں سے دامن نہیں بچا سکا۔ رومن حروف سے اردو آوازیں پیدا کرنے کے لیے ماہرینِ لسانیات نے کچھ شکلیں وضع کی ہیں جو اس کمی کو پورا کرنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوئی ہیں اور ان علامتوں کی تفصیلات یہاں ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

Vowels:-

u (و) a (آ) e (اے) i (ای)

O (او) OO (اُ) au (اَو) a i (اِ)

Consonants:-

b	(ب)	p	(پ)	t	(ت)	t	(ٹ)
s	(ث)	j	(ج)	ch	(چ)	h	(ح)
kh	(خ)	d	(د)	d	(ڈ)	z	(ذ)
r	(ر)	r	(ڑ)	z	(ز)	zh	(ژ)
s	(س)	sh	(ش)	s	(ص)	z	(ض)
t	(b)	z	(ظ)	'	(ع)	gh	(غ)
f	(ف)	q	(ق)	k	(ک)	g	(گ)
L	(ل)	m	(م)	n	(ن)	ṅ	(ں)
v	(و)	h	(ہ)	,	(ء)	i	(ی)
h	(ھ یعنی ہائے مخلوط التلفظ)						

(Standard Twentieth Century Dictionary (Urdu in to English) Compiled by Prof. Bashir Ahmed Qureshi)

مگر یہاں بھی کمی یہ ہے کہ ث س ص ح ہ ذ ز ض ظ ت اور ط کی آوازوں کے فرق کو واضح نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر سدا۔ صدا، اسرار۔ اصرار، صحرا۔ سہرا، ثنا۔ سنا وغیرہ الفاظ میں حروف کے صحیح مخارج کے علم کے بغیر اصل لفظ تک رسائی مشکل ہوسکتی ہے اور اس کا حل رومن حروف کے توسط سے واضح کرنا ناممکن ہے۔

دیوناگری اور رومن رسم خط کے بعد عربی حروف تہجی کا جائزہ بھی ضروری ہے۔

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز

س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک

ل م ن و ہ لا ء ی ے

جب اسی رسم خط کو فارسی والوں نے اپنایا تو اس میں پ چ ژ اور گ کا اضافہ ہوگیا، گویا عربی میں یہ چار حروف نہیں ہیں۔ لہٰذا ان حروف کے اضافے سے یہ خط فارسی رسم خط کے نام سے جانا گیا۔ لیکن

جب عربی، فارسی ہندستان میں داخل ہوئیں تو یہاں کی مقامی بولیوں اور زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان وجود میں آئی جو ابتدا میں ہندی، ہندوی، ہندستانی، ریختی یا ریختہ کہلائی اور آج اردو کے نام سے اس کی اپنی شناخت ہے۔ عربی، فارسی اور ہندستان کی مختلف مقامی بولیوں اور زبانوں کے اختلاط سے جو زبان وجود میں آئی یعنی اردو، اس کے لیے فارسی رسم خط ناکافی تھا۔ اس لیے اردو نے عربی، فارسی آوازوں کے ساتھ مقامی آوازوں کو بھی اپنایا اور فارسی رسم خط میں ٹ ڈ ڑ بھ پھ تھ جھ چھ دھ ڈھ رھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ کے علاوہ ان سبھی آوازوں کو شامل کیا جو عربی، فارسی میں اعراب کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو رسم خط دوسری زبانوں کے رسم خط سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ صرف اسی ایک رسم خط سے سنسکرت، ہندی، پنجابی، انگریزی اور دوسری بہت سی زبانوں کے تلفظ کو من و عن ادا کیا جاسکتا ہے اور یہ خوبی کسی دوسری زبان کے رسم خط میں نظر نہیں آتی۔ اردو اور اردو رسم خط سے عدم واقفیت نہ صرف اردو زبان و ادب سے محرومی کا باعث بن سکتی ہے بلکہ تلفظ کی ادائگی میں بھی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ ایک زبان کے دوسری زبان میں الفاظ تیزی سے سرایت کررہے ہیں۔ ضروری ہے کہ اردو جیسی شیریں زبان اور اس کے ہمہ گیر رسم خط کو سیکھا جائے جس سے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے الفاظ کا احترام بھی برقرار رہ سکے۔

Badr Street, Azeempura
Inside Delhi gate
Malerkotla, (Distt. Sangroor) Pb.

معالجات

(جلدِ اوّل تا چہارم)

حکیم وسیم احمد اعظمی

طبیہ کالجوں کے طلبہ و اساتذہ کے لیے اہم نصابی سلسلہ

جلد اوّل	(امراضِ نظامِ اعصاب و دورانِ خون و تنفس)	قیمت -/104
جلد دوم	(امراضِ نظامِ ہضم و تولید و تناسل)	قیمت -/128
جلد سوم	(حمیات امراضِ متعدی)	قیمت -/120
جلد چہارم	(امراضِ جلد و متعلقاتِ جلد)	قیمت -/100

عمدہ کتابت و معیاری طباعت کے ساتھ مجلد ڈیلکس اڈیشن مع رنگین گردپوش

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر: قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک-۱، ونگ-6، آر-کے-پورم، نئی دہلی-006 110

فون: 6179657, 6103938, 6103381 فیکس: 6108159

حیدرآباد شاخ: 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد-500002

غلام یحییٰ انجم

اکیسویں صدی میں اسلامی مدارس — تقاضے اور امکانات

ہر صدی اپنے مخصوص کارناموں کے باعث اپنی ایک شناخت رکھتی ہے، آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ اکیسویں صدی سائنس اور ٹکنالوجی کی صدی ہوگی۔ جدید ایجادات اور جدید دریافتوں کے سبب حقیقت کبریٰ کے مظاہرے مزید ابھر کر سامنے آئیں گے اس لیے ضرورت ہے کہ ملت اسلامیہ اور اسلامی درسگاہیں ان کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوں تاکہ برادرانِ وطن کے ساتھ شانہ بشانہ چل کر اسلام کی حقانیت کا پرچم بلند کر سکیں۔

ہندستان میں اسلامی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے اور تقریباً بیسویں صدی کے ربع آخر سے ان مدارس کے نصاب، نظم و نسق اور فارغ التحصیل علما کے مستقبل کے بارے میں بحث و مباحثہ جاری ہے۔

روایتی انداز میں جو مدارس چل رہے ہیں ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر دور میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق اسلامی مدارس کے نظام میں تبدیلی آئی ہے اور ان کے نصاب اور طریقۂ درس پر غور و خوض ہوا ہے۔ کسی زمانے میں علوم نقلیہ اور کسی زمانے میں علوم عقلیہ حاوی رہے۔ آج کل اکثر مدارس میں عربی زبان و ادب پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس تبدیلی اور نصابی ترمیم کا مقصد ظاہر ہے کہ نصاب کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ اگر یہ گنجائش مدارس کے روایتی نظام میں موجود ہے تو پھر اس صدی کے مطالبات اور چیلنج جو ہمارے سامنے ہیں ان کے مطابق ہم اپنے نصاب کو کیوں نہیں مرتب کرتے؟

یہ واضح رہے کہ اسلامی مدارس کا بنیادی مقصد ہی فروغ علم ہے کیونکہ رسول مقبول ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد علم کی نشر و اشاعت کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و یعلمھم الکتٰب و الحکمۃ" (سورۃ الجمعۃ آیت 2)

علم کی اسی اہمیت اور عظمت کے سبب اسلامی مدارس قائم ہوئے، کتابیں لکھی گئیں اور مجالس وعظ کا سلسلہ شروع ہوا۔ شیخ سعدی نے اپنے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

پنے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

دینی اصطلاح میں اقرار توحید سے علم شروع ہوگا اور اثبات توحید پر اس کے سفر کی منزلیں ختم ہوں گی۔ اس علمی سفر میں انفس اور آفاق میں طرح طرح کے مظاہر سامنے آتے ہیں جن کے ذریعے ذات باری تعالیٰ کی کنہ و حقیقت کا ادراک ہوتا ہے۔ اس توضیح کی روشنی میں علم کو دینی اور دنیاوی دو خانوں میں تقسیم کرنے کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ جو لوگ علم کو دو خانوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا کہ وہ روح علم سے نابلد ہیں۔ دین کے مقابلے میں دنیا نہیں بلکہ بے دینی اور آزاد روی ہے اور دنیا کے بالمقابل آخرت ہے، جس کی طرف قرآن حکیم میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے

"ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃً و فی الآخرۃ حسنۃً و قنا عذاب النار" (البقرہ 201)

(اے رب ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور آگ کے عذاب سے بچا)۔

اگر دین و دنیا میں مغائرت ہوتی تو اللہ رب العزت کسی بھی دیندار کو دنیا کی آسائش اور اس کی نعمتوں اور لذتوں سے محظوظ ہونے کی ہرگز دعوت نہ دیتا۔ یہ واضح رہے کہ دنیا کی وہی چیزیں ممنوع قرار دی گئی ہیں جو فطرت کے خلاف ہیں اور بندگان خدا کو ان سے کسی نہ کسی طرح کا نقصان ہے۔ علم علم ہے، یہاں کسی قسم کی تقسیم ناقابل قبول ہے اور جب یہ زاویۂ نظر مبنی بر صداقت ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلامی مدارس کے ارباب حل و عقد بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے نصاب میں ان تمام علوم کو شامل کر سکتے ہیں جن پر کائنات اور رب کائنات کی معرفت کا انحصار ہے۔ قرآن حکیم میں خلیفۃ اللہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام ملائکہ پر جو فضیلت حاصل ہوئی وہ صرف علم ہی کی بنیاد پر ہوئی۔ یہاں یہ علم اپنے تمام انواع اور اقسام کو محیط ہے۔ اس میں دین اور دنیا کی کوئی تخصیص نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

علم آدم الاسماء کلھا (البقرہ۔ 31)

حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام سکھائے (کنز الایمان)

اس حکم عام سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین و آسمان کے سارے علوم سے روشناس کرایا گیا۔ مفسرین کے بقول حضرت آدم علیہ السلام پر تمام اشیا پیش فرما کر آپ کو ان کے اسماء، صفات، افعال و خواص، اور اصول صناعات سب کا علم بطریق

الہام عطا فرمایا گیا۔ اس تفسیری وضاحت کا مطلب یہ ہے کہ تمام سائنسی علوم، ایجادات اور انکشافات سب کچھ علم کے دائرے ہی میں شامل ہیں۔ علّم مالم یعلم میں بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے یعنی انھیں ہر وہ علم سکھادیا گیا جو وہ نہیں جانتے تھے۔ اس عموم میں وہ تمام سائنسی ایجادات، انکشافات، دریافتیں اور نت نئی تحقیقات جو قیامت تک ہوتی رہیں گی، شامل ہیں۔ آیت کریمہ کا یہ ٹکڑا سب کو محیط ہے۔ علم کو دین اور دنیا کے الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا قرآن کی روح کے خلاف ہے کیونکہ علم کے کسی بھی حصے سے جو شخص بے بہرہ ہو اس کے سر پر خدائی نیابت کا تاج زریں کس طرح زیب دے گا۔ ایک موقعے پر اللہ کے نبی ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا کہ اپنے میں قوت پیدا کرو۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس زمانے میں جس چیز کا عروج ہو اگر وہ اسلام میں ناجائز اور حرام نہیں تو اس میں کمال پیدا کرو، یعنی اگر تیر اندازی کا زمانہ ہے تو اس سے قوت پیدا کرو اور اگر شہ سواری کا زمانہ ہے تو اس سے قوت پیدا کرو۔

اسلامی مدارس کے نصاب میں بعض ایسی کتابیں درس میں شامل ہیں جن کے ادق مباحث کو صرف ذہنی ورزش کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، جیسے شرح جامی میں بحث حاصل و محصول اور ملا حسن کی بحث جعل مرکب اور جعل بسیط وغیرہ۔ یہ ایسے مباحث ہیں جو صرف دس فی صد طلبہ کی سمجھ میں آتے ہیں اور وہ بھی زیادہ دنوں تک ذہن میں محفوظ نہیں رہتے۔ اس لیے ایسے مباحث کے بجائے ان مضامین کو شامل کرنا زیادہ قرین قیاس ہے جن میں ذہنی ورزش کم مگر نتائج کے اعتبار سے نفع زیادہ ہے اور وہ عصر رواں کے تقاضوں کے عین مطابق بھی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ نصاب درس میں جن مضامین کی ترمیم کی بات کی جارہی ہے وہ علوم نقلیہ نہیں بلکہ علوم آلیہ ہیں اور قرآن و احادیث کی تفہیم میں ایک آلے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اگر ان کی جگہ وہ مباحث شامل درس کیے جائیں جن کی حیثیت علم آلی ہی کی ہو مگر عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہو تو ادارے کو نصابی اعتبار سے کسی اضافی بار کا متحمل نہ ہونا پڑے گا۔ صرف نظم و نسق میں جزوی ترمیم کرنی ہوگی۔ سردست تمام اداروں میں اگر یہ عمل ممکن نہ ہو تو اس کام کے تجربے کے لیے کچھ اہم ادارے مخصوص کرلیے جائیں اور اس خصوص میں ان اداروں کو ترجیح دی جائے جو نہ صرف مالی وسائل کے اعتبار سے مضبوط ہوں بلکہ اس کی تعلیم کا بحسن و خوبی انتظام بھی کرسکتے ہوں۔ قرآن و احادیث کے وہ مباحث جن کی سائنسی توجیہ کی ضرورت ہو اگر ان کی توجیہ سائنس کی روشنی میں ہی کی جائے تو اس کے اثرات انتہائی نفع بخش ہوں گے اور وہ لوگ جو جدید ذہنیت کے علمبردار ہیں ان کے لیے بھی یہ توجیہ قابل قبول ہوگی۔ بلاشبہ اس طرز عمل سے اسلام کا آفاقی پیغام دور دور تک پہنچ جائے گا۔ مثال کے طور پر قرآن کی یہ آیت

الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذآ انتم منه توقدون (یٰسین 80)

(وہی جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے پیڑ میں سے آگ پیدا کی جبھی تم اس سے سلگاتے ہو)

سورہ یٰسین کی یہ آیت باغی انسانوں کے الحاد اور اس سے پیدا ہونے والے مسخ شدہ استدلال کے خلاف ایک خدائی اعلان ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی فرماتے ہیں:

عرب میں دو درخت وہاں کے جنگلوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، ایک کا نام مرخ ہے اور دوسرے کا نام عفار ہے۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ جب ان کی سبز شاخیں کاٹ کر ایک دوسرے پر رگڑی جائیں تو ان سے آگ نکلتی ہے، باوجود اس کے کہ وہ اتنی تر ہوتی ہیں کہ ان سے پانی ٹپکتا ہوتا ہے۔ اس میں قدرت کی کیسی عجیب، غریب نشانی ہے کہ آگ اور پانی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک جگہ ایک لکڑی میں موجود پانی نہ آگ کو بجھائے نہ آگ لکڑی کو جلائے (خزائن العرفان)

سرسبز و شاداب درخت سے آگ پیدا ہونے کا تصور بآسانی ذہن باور کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن یہ ایک قرآنی حقیقت ہے جسے کسی طور پر جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اس ترقی یافتہ دور میں قرآن کے اس فلسفے کا علم ہوا، آج سے چودہ سو سال قبل اس قرآنی حقیقت تک رسائی ممکن نہ تھی کیوں کہ اس وقت تک آکسیجن کے ساتھ مل کر حرارت روشنی اور شعلہ پیدا کرنے کی صلاحیت کی دریافت معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ کئی صدیوں بعد اس حقیقت تک رسائی ممکن ہوسکی کہ یہ جلنا، جلنے والے مواد میں آکسیجن اور کاربن کے امتزاج سے واقع ہوتا ہے پھر اس کے بعد یہ دریافت ہوئی کہ آکسیجن پودوں اور سبز درختوں سے پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے کی ایک دوسری مثال پانی جل جانے کی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں پانی جل جانے کا ذکر ہے، اس کی تفہیم سائنس سے ربط پیدا کرنے کے بعد ہی ممکن ہوسکے گی۔ اگر اس کی توجیہ قرآن و حدیث

کی روشنی میں کر کے کسی جدید ذہن رکھنے والے کو سمجھائیں تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن اسی پانی جل جانے کو اگر اس طرح سمجھایا جائے کہ پانی کی ترکیب دو اجزا سے ہوئی ہے۔ ان میں ایک آکسیجن اور دوسرا ہائیڈروجن ہے۔ آکسیجن کا کام بھڑکانا اور ہائیڈروجن کا کام بھڑکنا ہے۔ پانی انھی دو گیسوں کا مرکب ہے اور ہم کہیں کہ پانی کی ترکیب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے بٹ جائے گی۔ نتیجتاً ہائیڈروجن جل جائے گا اور آکسیجن بھڑکائے گا۔ بات وہی ہے لیکن عصری علوم کی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی تو یہ سادہ سی توضیح جدید عقلوں کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہوگی، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں علومِ اسلامیہ کے ساتھ علومِ عقلیہ بطور خاص تجرباتی علوم کا ایک حصہ بھی نصاب میں شامل کر لیا جائے تو موجودہ دور کی رہنمائی بھی ہوگی اور نصوصِ قرآنیہ اور احادیث کے سمجھنے میں مدد بھی ملے گی۔

مدارس سے فارغ شدگان میں چند ہی ایسے ہوتے ہوں گے جنھیں نوکری نہ ملتی ہو یہ اور بات ہے کہ ان کی تنخواہیں پرکشش نہیں ہوتیں۔ اس کے برخلاف یونیورسٹی اور کالج کے فارغین کی ملازمت سے وابستگی کا جو گراف ہے وہ بھی ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔ یہ بات مشاہدے میں ہے کہ مدارس کے وہ طلبہ جن کی رسائی کسی طرح کالج اور جامعات تک ہو جاتی ہے، وہ اپنے مضامین میں بہت اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ اگر دینی مدارس کے اربابِ حل و عقد عہد حاضر کے تقاضوں کو محسوس کر کے اپنے نصاب کو ان سے مزین کر لیں تو مدارس سے فارغ شدگان طلبہ ملک وملت کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

Head, Deptt. of Islamic Studies,
Hamdard University, Sangam Vihar, New Delhi

جامع انگریزی۔اردو لغت

حصہ اوّل تا ششم

مدیرِ اعلیٰ :- کلیم الدین احمد

☆ محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔

☆ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔

☆ تمام مروّج علوم و فنون سے متعلق انگریزی / اردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ۔

☆ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت جو وبیسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

☆ اردو زبان میں نئے سائنسی تصورات اور نئی علمی جہتوں کے اضافے کے ساتھ۔

☆ اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ

☆ دو سو سے زائد سائنسی و سماجی علوم و فنون پر محیط

☆ امریکی / برطانوی انگریزی کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ

☆ قومی اردو کونسل کا ایک یادگار کارنامہ..... ایک تاریخی دستاویز بڑا سائز 11.5x9 11 ۔ عمدہ کاغذ، بہترین طباعت..... کمپیوٹر شدہ کتابت مضبوط و مطلا جلد..... صفحات: حصہ اوّل (1217، قیمت 400)، حصہ دوم (1062، قیمت 600)، حصہ سوم (1091، قیمت 600)، حصہ چہارم (866، قیمت 600)، حصہ پنجم (1042، قیمت 600)، حصہ ششم (1012، قیمت 600)

براہ راست طلب فرمائیں یا کسی کتب فروش سے خریدیں۔

صدر دفتر : قومی اردو کونسل، ویسٹ بلاک۔8، ونگ۔6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110 006

فون : 6103381, 6103938, 6179657 فیکس : 6108159

حیدر آباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔500002

جواد رضوی

جدوجہدِ آزادی میں حیدرآبادی مسلمانوں کا حصّہ

ریاستِ حیدرآباد میں جنگِ آزادی کی بات شاید بعض حلقوں میں کچھ عجیب سی معلوم ہو اور پھر اس جدوجہد میں یہاں کے مسلمانوں کے رول کی بات اور بھی تعجب خیز سمجھی جائے۔ اس تعلق سے ایک دل چسپ واقعہ سن لیجیے! کامریڈ مخدوم محی الدین کے انتقال کے بعد کامریڈ روی نارائن ریڈی یہ کوشش کررہے تھے کہ مخدوم کی زوجہ کو مجاہد آزادی کا وظیفہ مل جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعلقہ افسر سے ملاقات کی۔ اس افسر نے وظیفے کی درخواست پڑھنے کے بعد بڑی حیرت سے یہ پوچھا کہ "کیا مسلمان بھی مجاہد آزادی ہوتے ہیں؟" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ریاستِ حیدرآباد کے مسلمانوں کے تعلق سے غیر مسلم عوام کا ایک طبقہ اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہا ہے۔

دکن میں شیر میسور ٹیپو سلطان نے 4/ مئی 1799ء کو سری رنگاپٹم کے میدانِ کارزار میں سامراجی فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد ریاستِ حیدرآباد میں کمپنی سرکار کے خلاف پہلی بغاوت آج سے کوئی 192 سال قبل ہوئی جب 1806 میں سکندرآباد کی چھاؤنی میں مقیم سب سیڈری فورسز (Subsidiary Forces) کے سپاہیوں نے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ اس وقت آصف جاہ سوم سکندر جاہ کا دور تھا (1829-1803) اور آصف جاہی سلطنت قائم ہوئے مشکل سے 80 برس گزرے تھے۔ حیدرآباد میں بھی بغاوتوں کا سلسلہ وقفے وقفے سے مختلف طور طریقوں سے اور اتار چڑھاو کے ساتھ 1898 تک (یعنی 92 برس) جاری رہا۔ ان بغاوتوں کو اس بے دردی سے کچل دیا گیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تاکہ آنے والی نسلوں کو ان سے ناواقف رکھا جائے۔ تاریخ کو مسخ تو کیا جاسکتا ہے لیکن پوری طرح چھپایا نہیں جاسکتا۔

ریاستِ حیدرآباد کی تاریخ میں 18ویں صدی کے آخری پانچ دہے (1800-1759) بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ان پچاس برسوں کے دوران آصف جاہی حکمرانوں اور کمپنی سرکار کے درمیان کئی معاہدے طے پائے جن کے نتیجے میں ریاست کا رقبہ مسلسل سکڑتا گیا اور شاہی اختیارات کو سلب کیا جاتا رہا، ریاستی معاملات میں رزیڈنٹ کی مداخلت میں اضافہ ہوتا رہا اور بالآخر 1800ء کے معاہدۂ معاونت نے تو حیدرآباد کی ایک آزاد سیاسی وحدت کو بالکل ختم کر دیا اور وہ عملاً کمپنی سرکار کی ایک تابعدار ریاست بنادی گئی۔ یہاں کمپنی سرکار نے بڑی تعداد میں اپنی فوج مستقل طور پر متعین کردی۔ یہ حالات ریاست کے امرا کے ایک طبقے اور باشعور عوام میں کمپنی سرکار کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ امرا کے ذاتی مناقشات اور آپسی ٹکراو بھی شروع ہوگئے تھے۔ 1815ء سے 1857ء کی پہلی جنگِ آزادی تک کے 40 سالہ دور میں کئی بغاوتیں ہوئیں اور ان بغاوتوں میں آصف جاہی خاندان کے شہزادوں فوجی اور سول عہدیداروں نے حصہ لیا جن میں عالی جاہ بہادر، مبارزالدولہ، صمصام الدولہ، اقتدار الدولہ، اقتدار الملک، ممتاز الدولہ، عظمت جنگ، اسمٰعیل یار جنگ، نواب فیاض جنگ اور کرنول کے نواب غلام رسول شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ابتدائی دور میں جن امرا نے حصہ لیا ان کے نام ہیں نورالامرا، راجہ راؤر مچھا نمبال کر اور راجہ مہی پت رام۔

اس دور کی سب سے اہم بغاوت میر گوہر علی خاں نواب مبارزالدولہ کی ہے جو سکندر جاہ آصف جاہ سوم کے فرزند اور ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے بھائی تھے۔ یہ بغاوت 1815ء سے شروع ہو کر وقفے وقفے سے 24 سال (1839ء تک) جاری رہی جس کی پاداش میں انھیں تین مرتبہ قلعۂ گولکنڈہ میں نظربند رکھا گیا۔ ان کی قید کی جملہ مدت 22 سال تھی۔ یہ بغاوت اس لیے بھی اہم تھی کہ اس کے پیچھے کل ہند وہابی تحریک (1831-1786) اور اس کے نظریات کارفرما تھے۔ اس تحریک نے آگے چل کر 1857ء کی جنگِ آزادی میں اہم رول ادا کیا۔ اس دور میں فرائضی (Fraezi) تحریک شروع ہوئی (1840-1781) جس کی بنیاد حاجی شریعت اللہ نے مشرقی بنگال میں رکھی اور ان کے فرزند محمد محسن عرف دادو میاں نے اس کو آگے بڑھایا۔ وہ چاہتے تھے کہ دور رس سیاسی اور سماجی اصلاحات کی جائیں۔ وہ زمینداری اور کسانوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف تھے اور زمین کو کسانوں کی ملکیت مانتے تھے۔ وہابی بنیاد پرستی کا احیا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ اسلام کے دائرے سے بدعات کو خارج کر دیا جائے۔ فرائضی جدوجہد بھی وہابی تحریک کے مماثل ہی تھی۔ یہ اسلام سے دور مسلمانوں کو اس کے قریب لانا چاہتے تھے۔ حیدرآباد میں پہلی جنگِ آزادی سے کئی برسوں پہلے کرنول، اورنگ آباد، بیڑ، کپل،

اودگیر، بیدر، عادل آباد، مومن آباد اور راچور وغیرہ میں بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا جن میں ایک سو سے زائد مجاہدینِ آزادی (بشمول مسلمان) نے حصہ لیا۔ اس دور کی بغاوتوں کی اہمیت یہ تھی کہ ان میں گونڈ اور بھیل قبیلوں، روہیلوں اور عربوں نے نمایاں حصہ لیا اور اس جدوجہد کو ایک لڑاکا روپ دیتے ہوئے چھاپہ مار لڑائی کے طریقہ کار کی ابتدا کی۔

ادھر شمالی ہند میں اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جہادِ حریت کا فتویٰ دیا اور کہا کہ "آج ہمارا ملک غلام ہو گیا ہے اور غلامی کو مٹانا اور حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ہمارا فریضہ ہے۔" شاہ صاحب کے اس فتوے کو عملی جامہ اس وقت پہنایا گیا جب مولانا سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی 10/ جنوری 1831ء کو انگریزوں کے خلاف بالاکوٹ کے معرکے میں شہید ہوئے۔ اس کے کوئی 26 برس بعد 1857ء کی شہرۂ آفاق پہلی جنگ آزادی کی ابتدا 23/ جنوری سے ہوئی جب دم دم (کلکتہ) کے سپاہیوں نے نئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ اس تاریخی بغاوت کی صدائے بازگشت 9 مہینے بعد حیدرآباد میں اس وقت سنائی دی جب 17/ جولائی 1857ء کو ہزاروں مجاہدین کا لشکر مولوی علاءالدین اور طرہ باز خاں کی قیادت میں برنش ریزیڈنس پر حملہ آور ہوا۔ ان مجاہدینِ آزادی نے ریزیڈنس کے سامنے دو مکانوں پر (ایک نواب قباص یار جنگ اور دوسرا راجہ گوپال داس کے مکان) اپنے مورچے قائم کیے اور وہاں سے ریزیڈنس کے اہم مقامات پر حملہ شروع کر دیا جو 6 بجے شام سے صبح 4 بجے تک جاری رہا۔ تمام رات گولہ باری ہوتی رہی اور 18/ جولائی کی صبح کو لڑائی ختم ہوئی۔

طرہ باز خاں اور ان کے ساتھیوں کو شہر سے کچھ دور گرفتار کیا گیا اور جب انھوں نے حراست سے بھاگنے کی کوشش کی تو انھیں دوبارہ گرفتار کر کے گولی ماری گئی اور ایک شاہراہ پر ان کی لاش لٹکا دی گئی۔ مولوی علاءالدین کئی دنوں تک مختلف مقامات پر روپوش رہے۔ بالآخر منگل پلی گانو میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور حبسِ دوام کی سزا دی گئی اور انڈمان بھیج دیا گیا جہاں ان کا 67 سال کی عمر میں بحالتِ نظربندی انتقال ہوا۔

1857ء کی فوجی بغاوت اور انڈین نیشنل کانگریس کے قیام 1885ء کی درمیانی مدت میں یعنی 28 برس میں مرہٹواڑہ، کرناٹک اور تلنگانہ (بشمول حیدرآباد و سکندرآباد) میں کوئی دو درجن بغاوتیں ہوئیں جن میں قابلِ ذکر اجنٹہ، چولہ، تلنگہ، پربھنی، گنگا کھیڑ، ہنگولی، شوراپور، مل کھیڑ، کولاس اور نظام آباد کی بغاوتیں ہیں۔ ان بغاوتوں میں 558 مجاہدین نے حصہ لیا جن میں مسلمان مجاہدین کی تعداد 366 تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام (1885ء) کے بعد حیدرآباد میں بھی بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اس نئی بیداری کو تحریک کا روپ دینے والوں میں سب سے آگے ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے اور ملا عبدالقیوم تھے۔ انھوں نے نہ صرف حیدرآباد میں کانگریس کی بنیاد رکھی بلکہ قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے ایک تنظیم "اخوان الصفا" شروع کی۔ اس قومی دھارے میں شریک ہونے والوں میں محب حسین، قوم پرست اخبار "ہزار داستان" کے ایڈیٹر سید عقیل، مولوی شرف الحق، مولوی اکبر علی، ماہنامہ "صحیفہ" کے ایڈیٹر مولوی محمد مظہر، محمد مرتضیٰ (حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی) محمد اکرم، ملا عبدالباسط، عبدالسلام اور کئی دوسرے لوگ تھے۔ انیسویں صدی کے پہلے دو دہوں میں حیدرآباد میں ایک جمود اور ٹھہراؤ کی سی فضا چھائی رہی اور یہ سکوت 1920ء میں خلافت تحریک شروع ہوتے ہی ختم ہو گیا۔

اس تحریک کے آل انڈیا لیڈروں میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد، قاضی عبدالغفار اور کئی دوسری جانی مانی شخصیتیں شامل تھیں۔ حیدرآباد میں بھی ایک مرکزی خلافت کمیٹی بنائی گئی جس کے معتمد جناب محمد اصغر (اصغر یار جنگ) بار ایٹ لا تھے اور اراکین میں پنڈت کیشوراؤ، مسز وامن ناٹیک، عبدالحئی، آریہ سماج کے پنڈت کرشناراؤ، عسکری حسن، محمد مرتضیٰ، ہمایوں علی مرزا اور کئی دوسرے شامل تھے۔ خلافت کمیٹی کی جانب سے 16/ مارچ 1920 کو ویویک وردھنی تھیٹرز میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا جس کی صدارت اصغر یار جنگ نے کی اور پنڈت دگمبر داس چودھری اور مولوی فیاض الدین کی تقاریر ہوئیں۔ 19/ مارچ کو پورے شہر میں کامیاب ہڑتال کرائی گئی۔ یہ تحریک صرف شہر حیدرآباد تک محدود نہیں تھی بلکہ ریاست کے اکثر اضلاع میں پھیل گئی تھی۔ چنانچہ خلافت کمیٹی کی اپیل پر مارچ اور اپریل کے مہینوں میں شہر کے علاوہ گلبرگہ، اورنگ آباد، راچور، کریم نگر، جنگاؤں، محبوب نگر اور دوسرے کئی مقامات پر مسجدوں اور عیدگاہوں میں "یومِ خلافت" کے شاندار جلسے منعقد کیے گئے جن میں ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اپریل 1920 میں مولانا شوکت علی نے گلبرگہ، راچور اور دوسرے اضلاع کا دورہ کیا۔ ہر جگہ ہزاروں ہندو مسلم عوام نے ان کا شاندار استقبال کیا اور

چندہ جمع کیا۔

اس تحریک کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و یک جہتی کا جذبہ نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ انھوں نے مشترکہ طور پر حکومت سے پرزور مطالبہ کیا کہ گائے کو ذبح کرنے پر قانونی پابندی لگادی جائے اور نظام سرکار کو اس متحدہ مطالبے کو تسلیم کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے اس اظہار یگانگت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہندوؤں کی جانب سے 14/ مئی 1920ء کو وکٹوریہ درد منی تھیٹرز میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔ اس تحریک کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے مسلم طلبہ نے اس میں بڑی سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا اور جب نظام نے خلافت تحریک کی طرف سے جلسے منعقد کرنے پر پابندی لگادی تو ان پرجوش نوجوانوں نے اس فرمان کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ 30/ مئی 1920ء کو ایک اور فرمان کے ذریعے پانچ حیدرآبادی نوجوانوں عبدالرحمن، رئیس، امیر احمد، سید ابراہیم، اے اسحاق اور عطا حسین کو منانور (حیدرآباد کا انڈمان) میں نظربند کردیا گیا اور دوسرے پانچ نوجوانوں محمد اسماعیل خاں، نواب احمد، محمد الحق، عبدالعزیز اور جمیل احمد کو حیدرآباد کے باشندے نہ ہونے کی بنا پر شہر بدر کردیا گیا۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہندو مسلم نفاق کے بیج بونے اور حیدرآبادی سماج میں فرقہ داریت کا زہر گھولنے کا بدبختانہ کام بھی شروع کردیا گیا۔ اس شہر کی آزادیوں پر کڑی پابندیاں لگادی گئیں۔ کانگریس، کمیونسٹ پارٹی اور دوسری تمام سیاسی پارٹیوں اور ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی۔ حکومت کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا جلسہ منعقد نہیں کیا جاسکتا تھا، یہاں تک کہ پنڈت موتی لال نہرو اور ڈاکٹر انصاری کے تعزیتی جلسوں کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ کسی قومی لیڈر کو حیدرآباد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسری طرف مجلس اتحاد المسلمین کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی۔ یہ تنظیم 1929ء میں ایک تبلیغی جماعت کی حیثیت سے شروع کی گئی تھی جو 1939ء میں ایک طاقتور سیاسی پارٹی میں تبدیل کردی گئی۔ ان دم گھونٹ دینے والے حالات کو عوام اب اور برداشت کرنے کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ وہ سامراجی حکمرانوں اور نظام شاہی کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد کی تیاری کررہے تھے۔ 1937-1947 کا دہا عوام کی اسی جدوجہد اور لڑائیوں سے عبارت ہے۔

اس عوامی جنگ کا بگل اس وقت بجا جب اگست 1938ء میں اسٹیٹ کانگریس نے ستیہ گرہ شروع کیا۔ ساری ریاست میں طلبہ نے وندے ماترم تحریک کا آغاز کیا اور آندھرا مہا سبھا نے بھی تلنگانہ میں کسانوں کی تحریک کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے نوجوانوں کی ایک سرپھری ٹولی نے 1939ء میں کامریڈز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جس کی پہلی مجلس عاملہ کے اراکین تھے مانک لال گپتا، سید عالم خوند میری، سید ابراہیم، احسن علی مرزا اور قطب عالم۔ کچھ عرصے بعد اس تنظیم میں مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، مرزا حیدر حسین، غلام حیدر اور راقم الحروف بھی شامل ہوگئے۔ اس کے دو سال بعد 1941ء میں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی گئی جس کے پہلے جنرل سکریٹری عاقل علی خاں تھے۔ او نکار پرشاد اور ایوب احمد اس کے تنظیمی سکریٹری تھے۔ اس کے اہم کارکنوں میں جواد رضوی، کوکب دری، رفیع احمد، دلاور علی خاں، عابد حسن (پلاننگ کمیشن کے سابق ممبر)، صفدر حسین، حسن ناصر (جو پاکستان میں شہید ہوئے)، جلال الدین صدیقی اور صفیہ سلطانہ تھیں۔

نوجوانوں اور طلبہ کی ان تنظیموں نے حیدرآباد میں سوشلسٹ خیالات کو عام کرنے، جمہوریت اور سیکولرازم کا پرچار کرنے، فرقہ واریت کے خلاف جدوجہد کرنے اور آپسی اتحاد و یک جہتی قایم کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا۔

دوسری عالمی جنگ (1939-1945) کے اختتام کے بعد سارے ملک میں کساد بازاری کا دور شروع ہوا۔ غذائی اجناس کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ ان حالات کے مضرت رساں اثرات سے عوام کا ہر طبقہ متاثر ہوا؛ خاص طور پر مزدور، کسان اور متوسط طبقہ۔ ان حالات کی وجہ سے مزدوروں میں ایک نیا ابھار پیدا ہوا۔ چناں چہ سکندرآباد اور حیدرآباد میں کئی ٹریڈ یونینوں کا قیام عمل میں آیا اور مزدوروں کی ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1941ء میں وزیر سلطان سگریٹ فیکٹری میں ہڑتال ہوئی۔ 1942ء میں آلوین چاقو فیکٹری میں ہڑتال ہوئی جس کے لیڈر سید عالم خوند میری تھے۔ اس سال ریلوے مزدوروں نے بھی ہڑتال کی جس کی رہنمائی فتح اللہ خاں اور کئی دوسرے کررہے تھے۔ پرانے شہر میں پہلی مرتبہ بٹن فیکٹریوں کے مزدوروں اور بلڈنگ مزدوروں کی یونین بنائی گئی جس کے لیڈر مخدوم محی الدین اور غلام حیدر کے علاوہ پی۔ لکشمی داس دیواراج، بالرام وغیرہ تھے۔ بٹن فیکٹریوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کے مالک اور مزدور تمام کے تمام مسلمان تھے۔

اس زمانے میں خواتین کی دو تنظیمیں تھیں: ایک مہیلا نوجیون منڈل تھی جس کی لیڈر پریم لتا گپتا تھیں اور اس کے اہم کارکن یشودھا بائی، پریملا تائی، برج رانی گوڑ اور سرجو بائی تھیں۔ دوسری عورتوں کی

انجمن امداد باہمی ملے پلی میں کام کر رہی تھیں جس کی لیڈر جمیل النساء باجی تھیں اور ان کے ساتھ کئی نوجوان مسلم لڑکیاں سرگرم عمل تھیں۔

حیدر آباد میں صحافت کی ابتدا رسالہ طب (1855ء) سے ہوئی۔ لیکن 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد حیدر آباد میں بھی صحافت کے فروغ کے لیے راستے کھل گئے اور جب 1884ء میں اردو ریاست حیدر آباد کی سرکاری زبان بنائی گئی تو اردو صحافت کو پھولنے پھلنے کے نئے مواقع فراہم ہوئے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ انیسویں صدی کے آخری پانچ دہوں میں اردو اور دوسری زبانوں کے جو بھی رسائل شائع ہوئے ان کی اکثریت قومی تحریک کی حامی تھی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا حیدر آباد میں 1946ء میں قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک کے سالار کارواں مخدوم محی الدین تھے اور ترقی پسندوں کے اس قافلے میں عابد علی خاں، حسینی شاہد، نیاز حیدر، محبوب حسین جگر، اختر حسن، اقبال متین، جیلانی بانو، عزیز قیسی، قمر ساحری، سردار سلیم، کلیم اللہ، سردار الہام، رضیہ اکبر حسین، زینت ساجدہ اور کئی دوسری شخصیتیں شامل تھیں۔

حیدر آباد میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد 1940-1939 کے درمیانی زمانے میں رکھی گئی جب وہ ایک غیر قانونی پارٹی کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ جولائی 1942ء میں پارٹی پر سے پابندی اٹھالی گئی لیکن نظام سرکار نے نومبر 1946ء میں پارٹی کو پھر غیر قانونی قرار دیا۔ پولیس نے پارٹی کے دفاتر اور لیڈروں کے مکانوں پر دھاوے کیے، کئی کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا اور اہم لیڈروں کو روپوش ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ان تمام پابندیوں، دھاووں، گرفتاریوں اور مظالم کے باوجود کمیونسٹ پارٹی نے آٹھ سال کی قلیل مدت (1948-1940) میں مزدوروں، متوسط طبقے کے نوجوانوں طالب علموں اور خواتین اور ادیبوں کو متحد و منظم کیا اور تلنگانہ میں آندھرا مہاسبھا کے ساتھ مل کر وہاں کے کسانوں کی ہتھیار بند لڑائی میں ہراول دستے کا رول ادا کیا۔

تاریخ ادب اُردو ۱۷۰۰ء تک

(جلد اوّل تا پنجم)

پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین

☆ عہد اولیں کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ۔

☆ محققین، اساتذہ، اہل علم و قلم، طلبہ اور عام اُردو داں حضرات کے لیے ایک بہترین تحفہ۔

☆ لائبریری اور دیگر اداروں کی اہم ضرورت۔

☆ یہ تاریخ نہیں دستاویز ہے۔

☆ قیمت فی جلد 170 روپے، مکمل سیٹ 850 روپے۔

جلد اوّل صفحات 462 جلد دوم صفحات 527

جلد سوم صفحات 467 جلد چہارم صفحات 431

جلد پنجم (مع اضافہ) صفحات 443

جو خریدار یا کتب فروش یکم جولائی 99 سے پیشتر یہ سیٹ خرید چکے ہیں کونسل سے مفت ضمیمہ طلب کر سکتے ہیں جو جلد پنجم کے تیرہویں باب پر مشتمل ہے۔

براہ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔ ۱، ونگ۔ 6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 006 110

فون : 6103381, 8179657, 6103938 فیکس : 6108159

حیدر آباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔ 500002

عارف ہندی
جاوید انور

انٹرویو

شمس الرحمٰن فاروقی سے کچھ باتیں
جدیدیت کے حوالے سے

عارف ہندی۔ فاروقی صاحب! سب سے پہلے جدیدیت پر بات کی جائے۔ وہ کون سی وجوہ تھیں کہ آپ نے ترقی پسند نظریات کی پرزور مخالفت کرتے ہوئے جدیدیت کی سربراہی کی؟

شمس الرحمٰن فاروقی: بھائی جدیدیت کی سربراہی کا رتبہ تو میں قبول نہیں کر سکتا۔ میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں۔ جدیدیت کی تاریخ میں بہت سے لوگ ہوئے ہیں۔ لیکن میں بہر حال یہ کہہ سکتا ہوں کہ باقاعدہ اور مسلسل طور پر ادبی نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تحریریں شاید پہلے میں نے لکھیں جن میں ترقی پسند نظریات ادب کو رد کرنے اور جدیدیت کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ترقی پسند نظریات میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ نامکمل معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ان کے یہاں فرد پر کوئی زور نہیں تھا۔ انسان کے اپنے وجود پر، اس کے مسائل پر، اس کے اپنے داخلی باطنی تصورات پر، کوئی زور نہیں تھا۔ انسان صرف سماج کا ایک حصہ تھا اور مفروضہ یہ تھا کہ سماج کے مسائل اگر بیان ہو جائیں تو انسان کے مسائل بیان ہو جائیں گے۔ اس پر طرہ یہ کہ سماج کے مسائل کے بارے میں بتانے والا کون تھا؟ کمیونسٹ پارٹی یا مارکس، یعنی سماج کے اگر کچھ ایسے مسائل ہیں جنھیں پارٹی پروگرام یا مارکسی تھیوری میں جگہ حاصل نہیں ہے، تو وہ سماج کے مسائل نہیں کہلائیں گے۔ اس طرح دو مشکلیں پیدا ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اس ادب میں فرد غیر حاضر ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ جو مسائل ہیں ان کے بارے میں بھی یہ حکم ہے کہ ان میں سے وہی مسائل درست اور قابلِ ذکر مانے جائیں گے جن کا تصور پارٹی کے خیالات میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک کے زمانے میں عورتوں کے مسائل کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ عورتوں کے صرف ایک طرح کے مسائل یعنی جنسی مسائل کے بارے میں صرف عصمت نے لکھا تو ان کو برا بھلا کہا گیا اور کہا گیا کہ یہ ترقی پسند تصورات کے منافی ہے کہ ہم اس طرح کی چیزیں لکھیں اور ان کو فحش بھی قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ فحش یا غیر فحش کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مسئلہ دراصل پارٹی لائن کا تھا۔ طوائف کے بارے میں سب نے لکھا۔ طوائف ایک فیشن ایبل مسئلہ تھی۔ لہٰذا اس کے بارے میں بیدی نے بھی لکھا۔ منٹو نے بھی لکھا، جو اگرچہ ترقی پسندی سے بعد میں ہٹا دیے گئے۔

ع۔ہ لیکن شاعری میں تو لکھا گیا جیسے مجاز نے جوش وغیرہ نے لکھا۔

ش۔ف۔ جوش، مجاز دونوں ہی ترقی پسند شاعر نہیں ہیں۔ لیکن اگر ان کو ترقی پسند مان بھی لیا جائے تو عورتوں کے مسائل سے مراد یہ نہیں ہے کہ

ترے ماتھے پہ لہراتا یہ آنچل خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

عورتوں کے مسائل سے مطلب یہ ہے کہ عورت بطور طبقے کے، سماج کے ایک حصے کے طور پر، اتنی ہی ناانصافی اور ظلم کا شکار ہے جتنا کہ مثال کے طور پر مزدور۔ لیکن مارکسی تھیوری میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ مارکسی تھیوری میں تو یہ ہے کہ دو ہی طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں ایک تو Super Structure ہوگا جو طاقت والے لوگ ہیں اور ایک نچلا طبقہ ہوگا جس میں ہم آپ آتے ہیں۔ اور طبقاتی کشمکش ان لوگوں کے درمیان ہوتی ہے جو لوگ طاقت ور اور دولت مند ہیں، اور جو طاقت ور اور دولت مند نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نقشے میں کہیں سے عورتوں کا کوئی حصہ الگ سے نہیں۔ ہر چند یہاں عورتیں بھی مظلوم ہیں اور انصاف ان کو نہیں مل رہا ہے۔ لیکن ترقی پسندوں کو اس سے غرض نہیں۔ یعنی کلاس یا طبقے کی حیثیت سے عورت کا وجود ترقی پسند ادب میں نہیں ملتا ہے۔ طوائف کا وجود ضرور ملتا ہے۔ وہ سماج کے بے انصاف نظام کا ایک نمونہ ہے۔ طوائف اس وجہ سے مظلوم

● اردو میں ادب کی ترقی پسند تحریک کا طلسم توڑنے اور جدیدیت کے میلان کو فروغ دینے میں جن اہلِ قلم نے کلیدی کردار ادا کیا ان میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا نام بہت اہم اور نمایاں ہے۔ پچھلے دنوں عارف ہندی اور جاوید انور صاحبان نے الہ آباد میں اس حوالے سے ان کے ساتھ طویل انٹرویو کیا جس کا ابتدائی حصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ مکمل انٹرویو جو فاروقی صاحب کے ادبی نظریات اور ان کے علمی موقف کا پورا پورا احاطہ کرتا ہے کونسل کے سہ ماہی جریدے "فکر و تحقیق" کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں۔ اس حصے میں صرف عارف ہندی صاحب کے چند سوالات اور ان کے جوابات شامل ہیں۔

نہیں کہ وہ عورت ہے۔ بلکہ تصور یہ تھا کہ وہ طوائف ہے لہٰذا مظلوم ہے۔ تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ سب سے پہلی بات مجھے یہ نظر آئی کہ خود میرے، ایک انسان کی حیثیت سے، کوئی تصورات یا خیالات ہیں، کچھ پریشانیاں ہیں، کچھ ذہنی الجھنیں ہیں، کچھ گہرائیاں ہیں میری، لیکن ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے میں ان کو ظاہر نہیں کر سکتا کہ میرا کوئی وجود ہی نہیں ہے، وجود تو سماج کا یا پارٹی کا ہے۔

دوسری بات جو مجھے ناپسندیدہ لگی وہ یہ کہ انھوں نے تحریر کی پیچیدگی کو، کثیر المعنویت کو برا سمجھا، استعارے کو برا سمجھا، ایسی تحریر کو جس میں کئی معنی نکل سکتے ہیں، برا سمجھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ بالکل صاف تحریر ہو، جیسے کہ نعرہ یا تقریری بیان ہوتا ہے جس میں کسی کو شک کی گنجائش نہ ہو۔ لوگوں کو ایک خاص طرح سے، خاص لہجے میں زبان استعمال کرتے ہوئے سماجی تبدیلیوں اور انقلاب کی طرف مائل کیا جائے۔ جو کچھ ادب میں نے پڑھا تھا اس میں تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ ادب کی خوبی اس میں ہے کہ وہ کتنا معنی خیز ہے، اس میں کتنی باریکیاں ہیں۔

تیسری بات یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک میں ادب بطور فن کا ذکر نہیں آتا۔ ایک زمانے میں جب بہت نعرہ بازی تھی اور براہ راست گفتگو کا بڑا زور تھا ترقی پسند تحریریں بالکل اخباری بیان کی طرح ہو کر رہ گئیں، تو ڈاکٹر علیم صاحب نے لکھا ضرور کہ صاحب ادب وہ ہے جو نظر یاتی طور پر بھی ٹھوس اور درست ہو اور فنی تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ لیکن انھوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ فنی تقاضے کون سے ہیں اور کس طرح سے پورے ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ نظریاتی تبلیغ کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہم فنی تقاضوں کو پورا کر سکیں؟ اس کا جواب انھوں نے کچھ نہیں دیا۔ کیسے پورا کر سکیں گے؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ فنی تقاضے کیا ہوتے ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

چوتھی بات یہ کہ میں نے یہ دیکھا کہ ترقی پسند مزاج میں تجربے کی طرف سے بھاگنے کا رجحان ہے۔ یہ لوگ تجربے سے بھاگتے ہیں۔ بہت دن تک تو ان لوگوں نے معرا نظم کو قبول نہیں کیا، آزاد نظم کو قبول نہیں کیا۔ یہ مشکل تمام قبول کیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ غزل کے بھی منکر تھے وہ۔ میں نے دیکھا کہ نہ ان کے پاؤں روایت میں مضبوط ہیں اور نہ ان کے پاؤں جدید تجربے کی طرف قدم بڑھانے کے لیے تیار ہیں۔ بلکہ وہ 1925ء اور 1930ء کی شاعری جس میں زیادہ تر سادہ اور سیدھی بات کہی جاتی تھی، اسی طرح کی شاعری کے دلدادہ نظر آتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ادب میں نئے خیالات آئیں۔ نئے تجربات بھی آئیں۔ تجربات چاہے وہ ہیئت کے ہوں، چاہے موضوع، چاہے زبان کے ہوں، ان سب باتوں کے باعث میں نے محسوس کیا کہ ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی۔ جو کچھ بھی اس کا کام تھا وہ ہو چکا، اچھا یا برا۔ اب اس نے جو پابندیاں ادب پر عائد کر دی ہیں وہ پابندیاں ادب کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔

ع۔ہ۔ جدیدیت کو فروغ دینے میں آپ کے بنیادی خیالات کیا تھے؟

ش۔ف۔ اب جو میں نے آپ سے کہا اسی کو آپ دیکھ لیجیے کہ اس میں میرے خیالات منعکس ہیں۔ جدیدیت نے سب سے پہلے یہ کہا کہ ادب کو کسی فلسفے، کسی نظریے، کسی پابندی کا محکوم نہیں ہونا چاہیے۔ ترقی پسند ادب کہتا تھا کہ ادیب کو ایک خاص نظریے کا محکوم ہونا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ ادیب کو حق ہونا چاہیے کہ وہ کسی کی توقعات کو پورا کرنے کے لیے نہ لکھے بلکہ وہ اپنے طور پر جو سمجھتا سوچتا ہے وہ بیان کرے۔

دوسری بات یہ کہ زمانے کے نئے تقاضوں نے ادب کے معاملے میں بھی کچھ تبدیلیاں برپا کر دی ہیں۔ مثلاً اب لوگ ادب سے یہ توقع نہیں کرتے کہ اس سے کچھ اصلاح یا فائدہ ہو۔ بلکہ لوگ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ادب سے ہمیں اپنے بارے میں، انسان کے وجود کے بارے میں، کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ مسائل بدل گئے۔ اب جب انسان کی توقعات بہت حد تک ختم ہو چکی ہیں، اصلاح کی اور ترقی کی، پہلے جو بہت سی توقعات وابستہ کی تھیں ہم نے سائنس سے، فلسفے سے، مذہب سے، بڑی حد تک وہ شکست ہو چکی ہیں۔ اقدار جو پہلے اچھی تھیں اب ان کو برا کہا جا رہا ہے۔ نسل کشی کو اب اچھا سمجھا جا رہا ہے۔ ہم اپنے یہاں دیکھ رہے ہیں، یورپ میں دیکھ رہے ہیں، ویتنام میں دیکھ رہے ہیں، جگہ جگہ دیکھ رہے ہیں۔ ان نئے حالات کو، نئے ذہنی تناظر کو، بیان کرنے کے لیے نئی زبان چاہیے اور وہ نئی زبان اکثر مشکل ہوگی۔ اس لیے میں نے خاص کر اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ جدید شاعری اگر مشکل ہے مبہم ہے یا سمجھ میں آسانی سے نہیں آتی ہے تو یہ قصور پڑھنے والوں کا ہے کہ وہ اپنے ذہن کو اس طرف مائل نہیں کر رہے ہیں ورنہ یہ لامحالہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات بدلے ہوئے مسائل کو بیان کرنے کے لیے بدلی ہوئی زبان کا استعمال کیا جائے۔

ع۔ہ۔ ابتدا میں جدیدیت پر دو الزامات عائد کیے گئے۔ ایک تو یہ کہ جدیدیت مغرب کی نقالی ہے دوسرے یہ کہ جدیدیت کو اپنے روایتی ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جدیدیت نے ان الزامات کی تلافی کہاں تک کی؟ اور کیا یہ الزامات درست تھے؟

ش۔ف۔ ظاہر ہے کہ درست نہیں ہیں۔ نہ تھے اور نہ ہیں۔ میں نے لکھا ہے اور کہا بھی ہے۔ میری جو کتاب بہت

مرکزی مانی جاتی ہے "شعر غیر شعر اور نثر" اس میں اشاریہ اسما شامل ہے۔ آپ دیکھ لیں۔ اس میں کتنے نام مغربی ہیں اور کتنے نام مشرقی ہیں؟ اسی سے معلوم ہو جائے گا آپ کو کہ اگر اس کتاب کا لکھنے والا سراسر مغرب سے متاثر ہو کر لکھ رہا ہوتا تو اس میں زیادہ تر ذکر مغربی لوگوں کا ہوتا اور زیادہ تفصیل ان کے بارے میں ہوتی، مگر ایسا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ مغرب سے مستعار لینا یا کہیں سے مستعار لینا، یہ ہماری تاریخی ضرورت تھی۔ جب ہمیں انگریزوں نے شکست دی اور اپنا نظام ہمارے اوپر عائد کیا تو انھوں نے منظم طریقے سے ہماری اپنی روایات کی بیخ کنی شروع کر دی جس میں وہ بہت بڑی حد تک بلکہ تقریباً پوری طرح کامیاب ہوئے۔ لہٰذا دنیا کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم مغربی تصورات کی طرف رجوع ہوں کہ دیکھیں وہ کیا کر رہے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ جب زمانہ ترقی کر گیا، اس معنی میں ترقی کر گیا کہ دنیا پہلے بہت لمبی چوڑی تھی پھر بہت چھوٹی ہو گئی۔ سائنس نے دنیا کے ممالک کو نزدیک کر دیا، اور بہت سی قومیں مغرب کی محکوم ہو گئیں، تو یہ عام ہو گیا کہ مغرب کے خیالات کا احترام ہو۔

اب رہا سوال یہ کہ مغرب کے خیالات کو ہم بالکل مثل نوکر چاکر اور غلام کے برت رہے تھے، تو یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اگر یہ صحیح ہے تو ترقی پسندوں کے بارے میں صحیح ہے کیونکہ ترقی پسندوں کا پورا کا پورا فلسفہ مغرب سے لایا گیا ہے۔ آپ مغرب سے مراد یورپ لیں روس لیں تو، مغرب سے مراد آپ جرمنی لیں مغربی یورپ لیں تو، جس طرح سے آپ دیکھیں پوری پوری مارکسی تھیوری وہیں سے آئی ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا مغرب کی غلامانہ تقلید کا کوئی الزام اگر لگتا ہے تو وہ ترقی پسندوں پر لگتا ہے ہم لوگوں پر نہیں لگتا۔

ویسے ہی یہ کہتا ہے کہ ہم روایت سے منحرف ہیں۔ روایت سے منحرف ہونے کے معنی اگر یہ نکالے جائیں کہ ہم لوگ نہیں چاہتے کہ ہماری شاعری حالی اور آزاد کی "نیچرل شاعری" کے تقاضوں کو پورا کرے تو یقیناً ہم روایت سے منحرف ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ آپ غالب کے منکر ہیں، میر کے منکر ہیں، سودا کے منکر ہیں تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ بلکہ ترقی پسند البتہ ان کے منکر تھے۔ ان لوگوں نے بار بار پرانے لوگوں کا انکار کیا اور کہا کہ یہ شاعری بالکل بے کار ہے، اور از کار رفتہ ہو چکی ہے۔ غزل کو ان لوگوں نے کہا کہ جاگیر دارانہ سماج اور مزاج کی آئینہ دار ہے۔ یہ تو بہت بعد میں سردار جعفری نے میر کی غزل میں انقلابی تصورات کے عنصر ڈھونڈے، ورنہ پہلے یہ سب کہاں تھا؟ غزل لکھتے ہی نہیں تھے یہ لوگ۔ مجروح صاحب نے غزل لکھی، بہت مشکل سے پھر ان کی غزل مقبول ہوئی۔ شروع میں مجروح سلطانپوری کے مقبول نہ ہونے کی وجہ ترقی پسندوں کے یہاں ایک یہ بھی تھی کہ وہ غزل لکھتے رہے۔ آخر کار مجبور ہو کر ان کو ایسی غزل لکھنی پڑی ۔

آنچل کے میداں میں دور خی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

میں نے ایک دفعہ فیض صاحب سے کہا تھا کہ صاحب آپ ترقی پسند ضرور ہیں لیکن آپ کی شاعری کے بارے میں جو بہترین تحریریں ہیں وہ ہم لوگوں نے لکھی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک مضمون پڑھا علی گڑھ میں تو فیض صاحب کی نظم "ملاقات" کا ذکر تھا۔ میں نے اس نظم کی بہت تعریف کی۔ جذبی صاحب، جو ظاہر ہے فیض صاحب کے بزرگ دوست بھی ہیں، اور ترقی پسندوں کے بڑے شاعر بھی ہیں، مجھ سے انھوں نے کہا کیا یہ نظم آپ کی سمجھ میں آتی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں تو انھوں نے کہا میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آئی۔ تو ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی جذبی صاحب کو اس نظم کے بارے میں شک رہا کہ یہ بامعنی ہے کہ نہیں۔ میں نے فیض صاحب سے کہا کہ اس نظم کے بارے میں سب سے اچھا مضمون افتخار جالب نے لکھا ہے۔

یہ کہنا بھی بالکل غلط ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے پیش روؤں کی ہر چیز کو مسترد کیا۔ نہیں، جو چیزیں مسترد کرنے کے لائق تھیں انھیں مسترد کیا گیا۔ اچھا اب میرے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ صاحب آپ صرف میر ہی میر اور غالب ہی غالب کر رہے ہیں۔ داستان پر لکھ رہے ہیں۔ لیکن سوچیے تو پھر میں یہ کیوں لکھ رہا ہوں؟ اگر میری آنکھ پر صرف مغرب کی عینک چڑھی ہوئی تھی اور میں شیکسپیئر، ملٹن، بودلیئر اور ملارمے وغیرہ کے سوا کسی سے واقف نہیں تھا، تو میر اور غالب اور داستان اور کلاسیکی اردو شعریات یہ چیزیں میں کہاں سے لکھ رہا ہوں؟

ع۔ف۔ تو کیا روایتی ادب کو اس کا مرکزی مقام جدیدیت نے عطا کیا ہے؟

ش۔ف۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اور کم از کم میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ روایتی ادب سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس طرح کا ادب جس میں کوئی تخلیقی قوت نہ ہو۔ بلکہ یہ کہ جو ہماری روایت ہے، جو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے، جو ہماری تہذیبی تاریخ ہے، جو ہمارا تاریخی حافظہ ہے۔ ایسی تحریروں کو اپنی ادبی تاریخ کے مرکز میں ڈالنا، یہ کوئی خراب بات ہے؟ یہ کام کیا میں نے ضرور۔ یہ کام ترقی پسندوں کے وقت میں نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے پہلے بھی نہیں کیا گیا تھا۔ ترقی پسندوں ہی کو آپ کیوں کہتے ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ پچھلے سو سوا سو

برس سے ہمارے تہذیبی ورثے کو، ہماری روایت کو، بڑی حد تک بے دخل کرنے کا کام انگریزوں کے زیر نگرانی ہو رہا تھا اور اس کے کرنے والے ہمیں لوگ تھے، کیا حالی اور کیا آزاد سب لوگ یہی کرتے تھے۔

ع۔م۔ جدیدیت کو عام طور پر ایک تحریک قرار دیا گیا۔ ترقی پسندوں کے نزدیک تو یہ تحریک تھی ہی لیکن بعض جدیدیوں نے بھی اسے تحریک کہا۔ تو کیا اصل میں یہ کوئی تحریک تھی یا صرف ایک میلان تھا؟

ش۔ف۔ جدیدیوں نے تو نہیں کہا کہ یہ تحریک ہے۔ لیکن اگر کہا ہوگا.....

ع۔م۔ مثال کے طور پر لطف الرحمٰن نے اپنی کتاب "جدیدیت کی جمالیات" میں اسے جگہ جگہ تحریک لکھا ہے۔

ش۔ف۔ انھوں نے لکھ دیا ہوگا۔ میں پہلے بھی یہ کہہ چکا ہوں، یہاں بڑی خوبی یہی ہے کہ سب لوگ کسی ایک پارٹی لائن پر نہیں ہیں۔ جدیدیوں کا یہ کہنا تھا کہ جدیدیت تحریک نہیں ہے کیونکہ تحریک کے ساتھ ایک نظم وضبط وابستہ ہوتا ہے۔ اس کا منشور ہوتا ہے۔ اس کی ممبر شپ ہوتی ہے، اس کا کوئی صدر ہوتا ہے۔ شعوری طور پر اس کے کارکن اس تحریک کو جگہ جگہ عام کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ پھر یہ کہ ہر تحریک کے پیچھے کوئی فلسفہ، کوئی ذہنی اور فکری چوکھٹا ہوتا ہے جس میں وہ فٹ ہوتی ہے۔ اگر ہم جدیدیت کو کوئی تحریک مان لیں تو ہمیں یہ پوچھنا پڑے گا کہ وہ کون سا فلسفہ یا نظام ہے جس کو ہم جدیدیت کے چوکھٹے میں فٹ کر سکیں۔ ظاہر ہے کوئی نہیں ہے۔

فلسفے سے انکار سے یہ مراد نہیں کہ ہم فلسفے کو مانتے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ اپنے فلسفے کو خود اختیار کر لے۔ وہ اس کا پابند نہیں ہے کہ مارکس کو وہ اپنا خدا مان لے یا شیطان۔ ہمارے یہاں تو یہ تھا کہ آپ کامیو کو پڑھیے، آپ سارتر کو پڑھیے، آپ شنکر آچاریہ کو پڑھیے، آپ ابن عربی کو پڑھیے۔ جو کچھ اچھا لگے آپ پڑھیے۔ پھر دیکھیے کہ اس میں سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ جو حاصل ہو سکتا ہے وہ لے لیجیے۔ اگر یہ تحریک ہوتی تو ہم یہ کہتے کہ فلاں کو پڑھیے فلاں کو نہ پڑھیے جیسا کہ ترقی پسندوں نے کہا تھا۔ ترقی پسندوں نے اپنے یہاں کے تھرڈ کلاس کے لوگوں کو مثلاً Christophor Caud well جیسے لوگوں کو جو بالکل دو کوڑی کے لکھنے والے تھے، ہان کو بہت بڑا نقاد بنا کر پیش کیا اور ہاورڈ فاسٹ (Howard Fast) جو نہایت تھرڈ کلاس ناول نگار تھا اس کو بڑا ناول نگار بنا کر پیش کیا۔ یہ چیزیں ان کی پارٹی لائن کے مطابق تھیں۔ ہم نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔

ع۔م۔ ترقی پسندوں کا آج یہ خیال ہے، بلکہ چند جدیدیت پسندوں کا بھی خیال ہے کہ جدیدیت کوئی الگ نظریۂ ادب نہیں بلکہ ترقی پسندی کا ہی اگلا قدم ہے۔ اس خیال سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

ش۔ف۔ ظاہر ہے کہ میں بالکل متفق نہیں ہوں۔ ابھی تک میں جو کہہ چکا ہوں اور جو آپ سن چکے ہیں کہ ترقی پسند نظریۂ ادب کی جو بنیادی باتیں ہیں ان سب سے میں انکار کرتا ہوں۔ میں ادب کو کسی فلسفے، کسی نظریے کا پابند بنانا نہیں چاہتا۔ میں ادب کو ذات کا اظہار سمجھتا ہوں نہ کہ کسی سماجی مسئلے کا اظہار۔ اور اگر سماجی مسئلے کا اظہار بھی سمجھتا ہوں تو اس معنی میں نہیں کہ وہی مسئلہ سماجی مسئلہ ہے جس کے بارے میں پارٹی طے کرے گی کہ مسئلہ ہے کہ نہیں ہے۔ اور ادب کو تجربے کے اظہار کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں ادب کو روایت سے الگ کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اس سے اس کو جوڑنا چاہتا ہوں۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو کہ کسی صورت سے بھی ترقی پسندوں کو قبول نہیں ہو سکتیں۔ وہ ختم ہو گئے، تو اب رورو کے کہتے ہیں کہ ادب میں سماجی معنویت ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ پہلے تو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ مارکسزم ہونا چاہیے۔ اس سے کھسکے تو کہنے لگے صاحب سوشلزم ہونا چاہیے۔ اس سے کھسکے تو سوشلسٹ حقیقت نگاری کا ذکر کیا۔ وہاں سے پیچھے ہٹے تو سماجی معنویت پر آ گئے۔ یعنی اپنے کو انھوں نے اتنا بے چارہ پایا کہ اب وہ اس پر اصرار نہیں کرتے کہ آپ مارکس کے یا انگلز کے یا لینن کے خیالات کی ترجمانی کریں۔ بلکہ اب وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ اگر آپ سماجی شعور رکھتے ہیں تو ترقی پسند افسانہ نگار یا شاعر ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ سماجی شعور تو ہر آدمی رکھتا ہے۔ سماجی شعور کے بارے میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ کسی میں نہ ہو۔ ہم لوگوں میں ہے۔ لیکن ہم اس سماجی شعور کو کسی کی پابندی کا اظہار نہیں سمجھتے، بلکہ اپنے طور پر بیان کرتے ہیں۔

تو بہر حال ترقی پسندوں سے میرا بنیادی اختلاف ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے، ترقی پسندوں میں سے کچھ لوگوں نے مثلاً، اسے نئی ترقی پسندی کہنا چاہا، کچھ لوگوں نے تو سیج کہنا چاہا۔ لیکن نہ وہی لوگ اپنی بات پر قائم رہے نہ ان کی بات کوئی آج مانتا ہے۔ آج یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ بنیادی طور پر جو اختلافات ہیں، فکری اور ادب کے نظریے کے بارے میں، ترقی پسندی، جدیدیت کے درمیان، وہ اتنے گہرے ہیں کہ اب یہ سمجھنا کہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ قائم ہو سکتا ہے جو کہ تسلسل کا ہو، ایسا ممکن نہیں ہے۔

سیدہ جعفر

اُردو نثر سترھویں صدی میں

اکثر زبانوں کی طرح اردو ادب کی ابتدا بھی نظم سے ہوئی اور نثر کی طرف اس کے بعد توجہ مبذول کی گئی اس لیے ہمارے قدیم ادب میں شعری کارناموں کی بہتات ہے اور نثری تخلیقات کی بہ لحاظ زمانہ بہت بعد تشکیل عمل میں آئی۔ دکن میں اردو نثر کی نشو ونما اور ترقی کے سلسلے میں صوفیا اور اہل اللہ کی مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو نثر کا آغاز تبلیغ واشاعت کے ایک وسیلے کی حیثیت سے ہوا تھا اور اس کا مقصد ادبی نشو ونما نہیں بلکہ مذہبی احکام، اخلاقی تصورات و اقدار کی ترسیل اور دینی ترویج سے متعلق تھا اس لیے ہم اردو نثر کے ابتدائی نمونوں کو مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بزرگانِ دین کے اقوال وملفوظات اور پھر ان کے رسالے قابلِ ذکر ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کو ہم ملفوظات کے دور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس دور میں اردو نثر مربوط جملوں کی شکل میں پہلی بار ہمارے سامنے جلوہ گر ہوئی۔ کبھی ایک جملہ اور کبھی دو تین جملے بعض بزرگوں سے منسوب کیے گئے ہیں۔ بختیار کاکی اور فرید الدین شکر گنج کی گفتگو کا مشہور جملہ یا "جواہر فریدی" اور "سیر الاولیاء" میں شکر گنج کے مقولے[1] ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت نثر میں مربوط جملوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ نظام الدین محبوب الٰہی، نصیر الدین چراغ دہلی، شاہ بو علی قلندر پانی پتی، شرف الدین یحییٰ منیری، اشرف جہانگیر سمنانی، زین الدین خلد آبادی اور شاہ عالم سے منسوب بعض جملے اور فقرے نثر کی اس ابتدائی منزل کی نشان دہی کرتے ہیں جو مستقبل کے نثری رسالوں کے لیے زمین ہموار کر رہی ہے اور جس میں ملفوظات کی جگہ باقاعدہ جملوں نے لے لی ہے۔ اردو نثر ترقی کی سمت ایک قدم آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

باقاعدہ اور مکمل جملوں کے دور کا اختتام نثر کی مربوط تصانیف کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس رسالے کو اردو نثر کا اولین نمونہ قرار دیں۔ یہاں محققین اور مصنفین کے بیانات میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ اگر محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں فضلی کی "کربل کتھا" (1145ھ) کو نثر کا اوّلین نمونہ قرار دیا ہے تو عبدالحق نے خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" کو پہلی نثری کاوش تسلیم کیا ہے۔ شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں حضرت عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو اردو نثر کے اوّلین نقش مانا ہے۔ حامد حسن قادری نے "داستانِ تاریخ اردو" میں اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالے تصوف کو جو 857ھ کی تصنیف ہے، اردو نثر کا پہلا کارنامہ تحریر کیا ہے۔ جہاں تک شمس اللہ قادری کا تعلق ہے حضرت عین الدین گنج العلم کے رسالوں سے متعلق ان کا بیان غیر متحقق ہے۔ کسی دوسرے محقق کی نظر سے گنج العلم کے رسالے نہیں گزرے ہیں اور یہ ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" میں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا ہے کہ "معراج العاشقین" خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ وہ گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کے ابتدائی دور کے ایک بزرگ مخدوم حسینی کی نثری کاوش ہے۔ دکن کے مشہور صوفی ورہبر طریقت میراں جی شمس العشاق کے رسالے "مغز مرغوب" اور "چہار شہادت" 1966ء میں مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں مسعود حسین خاں لکھتے ہیں "شاہ میراں جی شمس العشاق سرزمین دکن کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں سے ہیں جن کے فیضِ نظر کے طفیل نہ صرف اس دیس میں نور کی ندیاں رواں ہوئیں بلکہ جنھوں نے ابلاغ وترسیل کے ایک نئے وسیلے یعنی "قدیم اردو" کی داغ بیل ڈالی"[2] لیکن تاحال ان کی کسی مستند اور متحقق نثری تصنیف کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں میراں جی شمس العشاق کے دو نثری رسالوں "گلباس" اور "جلترنگ" کا ذکر کیا ہے[3] حامد حسن قادری نے غالباً اسی بیان کے پیشِ نظر لکھا تھا "تصانیفِ نثر میں سے شرح مرغوب القلوب جل ترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں۔" لیکن حامد حسن قادری نے اپنے ماخذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ نذیر احمد نے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" میں اسی بیان کو دہرایا ہے اور وہ رقمطراز ہیں:

● پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر کی مرتّب کردہ اردو ادب کی تاریخ جو 1700 تک کے عرصے کا احاطہ کرتی ہے، قومی اردو کونسل نے پانچ جلدوں میں شائع کی ہے۔ ہر ایک جلد کی قیمت 170 روپے ہے۔ ان صفحات میں پیش ہے "تاریخ ادب اردو 1700 تک" جلد چہارم سے اقتباس۔

"میراں جی نے بھی کئی رسالے لکھے ہیں ان میں دو یعنی گل باس اور جلترنگ کے صرف نام ملتے ہیں۔ مولف 'اردوئے قدیم' نے ان کو دیکھا تھا"[5]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ "اردوئے قدیم" کے مصنف نے میراں جی شمس العشاق کے رسالوں کا کوئی اقتباس بھی نہیں دیا ہے اور نہ ہی کسی کتب خانے میں ان کے مخطوطات کا پتا چلتا ہے اس لیے شمس العشاق سے ان رسالوں کا انتساب مشکوک نظر آتا ہے۔[6]

ان امور کے پیشِ نظر ان کے فرزند برہان الدین جانم کی تصنیف "کلمۃ الحقائق" دکن میں نثر کا اولین کارنامہ قرار پاتی ہے۔ ابتدائی عہد سے لے کر امین الدین اعلا کے دور تک جو دکنی نثر کے رسائل دستیاب ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ ضخیم برہان الدین جانم کی "کلمۃ الحقائق" ہی ہے اور اس میں ایک مخصوص موضوع پر مسلسل اور مربوط انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" 990ھ۔ 1582ء سے قبل لکھی گئی ہے۔ "کلمۃ الحقائق" کا موضوع متصوفانہ ہے۔ مرید سوال کرتے ہیں اور رہبر اُن مختلف سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ ذات و صفات، قدیم و جدید، بے ہمہ و باہمہ، ابتدا و انتہا اور باقی و فانی جیسے موضوعات کی جانم نے عام فہم اور آسان زبان میں تشریح کی ہے۔ نفس اور وجود کی چار چار قسموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اُن مسائل سے بحث کی گئی ہے جن سے اس دور کے مریدوں اور طالبانِ عرفاں کو دلچسپی تھی۔ مختصر یہ کہ برہان الدین جانم کو پہلا مستند نثر نگار اور "کلمۃ الحقائق" کو دکن کی اولین مسلمہ نثری کاوش قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب ہم اس دور کی نثر کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس کے اسلوبِ بیان پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی نثر میں اکثر جگہ بے ربطی اور الجھاؤ موجود ہے۔ جملوں کی ساخت پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ دکنی نثر کے درمیان بار بار فارسی کے جملے عجز بیان کی غمازی کرتے ہیں اور ان سے پتا چلتا ہے کہ مصنف اپنے مافی الضمیر کی کماحقہٗ وضاحت کے لیے بار بار ایک زیادہ سنجھی ہوئی اور ترقی یافتہ نثر یعنی فارسی نثر کا سہارا لیتا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" کی زبان میں ادبیت کی تلاش بے سود ہے۔ اس کی تصنیف کا مقصد مسائلِ تصوف کی توضیح و تشریح تھا۔ "کلمۃ الحقائق" اس اعتبار سے اپنے عہد کا ایک کامیاب نثری نمونہ ہے کہ اس نے محدود مروجہ لغات اور اظہار کے سانچوں سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کام لیا ہے اور ایک ایسی زبان میں نثر لکھنے کی کوشش کی ہے جس کے خدوخال ابھی پوری طرح متعین نہیں ہوئے تھے اس لیے اگر عبارت میں جھول اور سقم نظر آتا ہے اور اس میں ادبی محاسن کی کمی ہے تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا، عہد طفولیت میں نثر کی ناہمواری ایک فطری امر معلوم ہوتی ہے۔ مسعود حسین خاں رقمطراز ہیں: "دبستانِ بیجاپور میں ہندو فلسفے اور سرّیت کی اصطلاحیں تصوف اسلامی کی اصطلاحات سے اس طرح گڈمڈ ہوگئی ہیں کہ بعض اوقات کچھ کا کچھ نکل آتا ہے"[7]۔ مکالمے کے انداز میں افہام و تفہیم کا طریقہ بہت قدیم ہے۔ قدیم یونانی ادب سے لے کر عہدِ متوسط کے ادبی کارناموں تک مکالمہ خیالات کی ترسیل و تشریح کا ایک موثر ذریعہ بنا رہا ہے۔ دکنی ادب کے قدیم نثری رسالوں میں سوال و جواب اور مکالمے کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ نثری رسالوں میں طالب یا مرید اپنے شبہات دُور کرنے کے لیے پیر طریقت یا روحانی رہبر سے سوالات کرتا جاتا ہے اور وہ اپنے شاگرد یا مرید کے سوالات کا جواب عام فہم انداز اور سلیس زبان میں دیتا جاتا ہے اور اس طرح کسی خاص موضوع کے تمام گوشوں پر اظہار خیال کا اچھا موقع ملتا ہے اور موضوع کے بنیادی پہلو یکے بعد دیگرے پوری صراحت، صفائی اور وضاحت کے ساتھ قاری کے سامنے آتے جاتے ہیں، مکالمے کے اسی انداز کو برہان الدین جانم نے "کلمۃ الحقائق" میں اپنایا ہے اور ان تمام متصوفانہ اور فلسفیانہ مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے واقفیت اس زمانے میں ذی علم ہونے کی دلیل تھی اور جن کا جاننا ضروری تصور کیا جاتا تھا۔

بیجاپوری نثر کے دورِ قدیم کے ایک اور نمائندہ مصنف محمود خوش دہاں تھے۔ محمود خوش دہاں شاہ بدرالدین حبیب اللہ کے نواسے اور "سکھ انجن" کے شاعر شاہ ابوالحسن کے بھانجے تھے۔ محمود خوش دہاں کے رسالے "واجب الوجود" سے ان کی نثر نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس رسالے میں "وجود" سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے پیر طریقت برہان الدین جانم سے اپنی وابستگی اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ محمود خوش دہاں نے اپنی عبارتوں کو اشعار سے مزین کیا ہے۔ محمود خوش دہاں کا ایک اور نثری رسالہ انجمن ترقی اردو دہلی کے کتب خانے کا مخزونہ ہے، اس کا نام "تنبیہ الغافلین" ہے۔ ان کی ایک اور نثری یادگار "رسالہ محمود خوش دہاں بیجاپوری" قبل 1000ھ۔ 1591ء ہے۔ محمود خوش دہاں نے اپنے مرشد جانم کی تقلید میں سوال و جواب کے طرز کو اپنایا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" میں کہیں کہیں سوال و جواب فارسی میں بھی ہیں لیکن خوش دہاں کی عبارتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری نثر ترقی کے ابتدائی مرحلے میں داخل

ہو گئی تھی۔ جانم کی نثر میں عبارتیں کہیں کہیں پیچیدہ اور گنجلک ہو گئی ہیں۔ لیکن ان کے مرید خوش دہاں کی نثر میں یہ سقم نظر نہیں آتا۔ نثر کے درمیان فارسی عبارتوں کا بار بار استعمال بھی مفقود ہو گیا ہے۔ محمود خوش دہاں تک پہنچتے پہنچتے شاید نثر میں یہ صلاحیت، قوتِ اظہار اور بالیدگی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہر طرح کے مطالب و موضوعات کو پیش کر سکے۔ اسی لیے محمود خوش دہاں کی عبارتوں میں فارسی نثر کی پیوند کاری نظر نہیں آتی۔ زبان کی قدامت اور اجنبیت ہنوز باقی تھی لیکن نسبتاً کم۔ جمیل جالبی نے جانم کی نثر میں "اشکال اور بے ترتیبی" کا ذکر کیا ہے[8] لیکن محمود خوش دہاں کی نثر میں ترتیب و تسلسل کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس میں زیادہ باضابطگی کا احساس ہوتا ہے۔

امین الدین اعلا نے اپنے والد اور اپنے جد کی طرح ادب کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ نثر و نظم کے ارتقاء میں ان کی ادبی کاوشیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں "گنج مخفی"، "وجودیہ"، "گفتار شاہ امین" "اشارات"، "ظاہر و باطن"، "بیان کرتے ہیں سجدیاں کا"، "عشق نامہ"، "شرح کلمۂ طیبہ" اور "کلمۃ الاسرار" ان کی نثری یادگاریں ہیں۔ امین الدین اعلا کی زبان جانم اور خس العشاق کے مقابلے میں نسبتاً صاف اور سلیس معلوم ہوتی ہے اس میں بے ربطی کی جگہ سلجھاؤ اور ترتیب نظر آتی ہے۔ امین الدین اعلا نے بھی متصوفانہ اور اخلاقی موضوعات سے سروکار رکھا ہے اس کے باوجود ان کی عبارتوں میں ادبی حسن کی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ امین الدین اعلا کی عبارتیں دکنی نثر کی اس مخصوص منزل کی نشاندہی کرتی ہیں جس میں نثر کے ظاہری خدوخال سنوارنے اور اسے صیقل کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں امین الدین اعلا کی نثر سے مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

صوفیائے دکن میں امین الدین اعلا کی شخصیت ایک منفرد شان کی حامل نظر آتی ہے۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں کو اپنی مساعی سے مالا مال کر دیا۔ امین الدین اعلا اور ان کے مریدوں کی بدولت اردو نثر تشکیل و تعمیر کے ابتدائی زینے طے کر کے بلندی کی طرف قدم بڑھا سکی اور ایک ایسی زبان جو "گھر بھاکا" کہلاتی تھی رشد و ہدایت اور ادب کی ترویج و ترقی کا سبب بنی۔ امین الدین اعلا کی عبارتوں کا ایک وصف ان کا مدلل اور پرزور انداز تحریر ہے۔ "کلمۃ الاسرار" امین الدین اعلا کا سب سے طویل نثری رسالہ ہے۔ مراتب وجود کی تفہیم و تشریح کے لیے انھوں نے تمثیلی اسلوب سے بھی کام لیا ہے۔ اسی طرح "لا" کی حقیقت بیان کرنے میں سکندر اور نوشابہ کے قصے سے مدد لی ہے اور دکنی نثر کو حکایت کی معنی آفرینی اور رمزیت اور ایمائیت سے روشناس کروایا ہے۔ "لا" کی اشاریت واضح کرنے کے لیے سمندر اور مچھلیوں کی علامت سے کام لیا ہے۔ امین الدین اعلا کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خانوادے کی روایات کو آگے بڑھایا اور اُسے مستقبل کی اُن منزلوں کی سمت بتائی جہاں اس کے مزاج، معیار اور اس کی انفرادیت کا تعین ہو سکا۔ دکن میں چشتیہ سلسلے کے ان بزرگوں کی پیروی میں ان کے خلفا معتقدین اور مریدوں نے بھی درس و تدریس کے سلسلے میں دکنی نثر سے کام لیا۔ اس ضمن میں شاہ میراں جی خدانما کے رسالے اور شاہ عبداللہ کی "احکام الصلوٰۃ" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ بقول حفیظ قتیل "میراں جی خدانما کی اہمیت ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک نثر نگار کی حیثیت سے ہے۔"[9] میراں جی خدانما کا شمار ان قدیم نثر نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے دکن میں نثر نگاری کا معیار متعین کیا۔ بندہ نوازی سلسلے میں تصنیف و تالیف کی روایت اتنی مستحکم اور مقبول ہو چکی تھی کہ اس سلسلے کے اکثر ذی علم اہل اللہ نے اس کی طرف توجہ کی۔ میراں جی خدانما کا تعلق گولکنڈہ سے تھا۔ ان کے نثری کارنامے دبستانِ گولکنڈہ کی نثر کے معیاری نمونے تصور کیے جاتے ہیں۔ شاہ میراں یعقوب نے جو میراں جی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ 1078ھ "شمائل الاتقیاء" کو دکنی نثر میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ ایسا رواں اور بے ساختہ ہے کہ اس پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ میراں یعقوب کو نثر نگاری پر قدرت حاصل ہے اور ان کی عبارتیں صاف ستھری اور دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔ میراں یعقوب نے حسبِ ضرورت اپنی نثر کو اشعار سے بھی مزین کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وجہی کے بعد میراں یعقوب گولکنڈے کا وہ نثر نگار ہے جس نے شعوری طور پر نثر کے صوری حسن کی طرف توجہ کی اور اسے سمجھنے اور سنوارنے کی کوشش کی۔ اس دور کی نثر تصوف و مذہبی علوم کی اصطلاحات کی بہتات سے گراں بار نظر آتی ہے۔

نثر کے اس دور کا اسلوب ادبیت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا جا رہا تھا۔ وجہی 1045ھ میں "سب رس" جیسا نثر کا بلند پایہ نمونہ پیش کر کے دکنی نثر کی ادبی صلاحیتوں، اس کی توانائی اور ترسیلی قوت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ میراں جی خدانما اور میراں یعقوب کا اسلوب وجہی سے مختلف تھا۔ میراں جی خدانما اور میراں یعقوب نے مقصدیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بھی جملوں کی ساخت، عبارتوں کی صفائی اور فقروں کے ارتباط کی طرف توجہ کی اس لیے اس دور کی تحریروں میں

کھردراپن کم ہوتا جارہا ہے۔ جانم کے بعض فقرے اور ان کی عبارتیں ناتراشیدہ اور بھدی معلوم ہوتی ہیں لیکن میراں یعقوب کے دور تک پہنچتے پہنچتے دکنی نثر کا حسن نمایاں ہونے لگتا ہے اور عبارتیں صیقل اور جلا سے آشنا ہونے لگتی ہیں۔ میراں یعقوب کا طرز تحریر سلیس اور بیساختہ ہے۔ "شمائل الاتقیاء" ترجمہ ضرور ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ میراں یعقوب نے اکثر جگہ فارسی محاوروں، روزمرہ، عجمی لب ولہجے اور آہنگ کو اردو میں اس طرح سمو دیا ہے کہ ان کی نثر میں جدت اور تازگی پیدا ہوگئی ہے۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ میراں یعقوب نے ایک اچھے نثر نگار کی طرح عربی اور فارسی عبارتوں کو اردو میں منتقل کرتے وقت جملوں کی نحوی ترکیب پر بڑی توجہ صرف کی ہے ورنہ اکثر ترجمے تعقیدِ لفظی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میراں یعقوب نے کہیں کہیں تشبیہات واستعارات کو بھی اپنی عبارتوں میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے دکنی نثر کو علمی ضروریات کی تکمیل کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کرکے یہ ثابت کردیا کہ اس نوخیز زبان میں بہترین صلاحیتیں موجود ہیں اور ان سے مناسب انداز میں کام لیا جاسکتا ہے۔ میراں یعقوب کی نثر میں "ہندوی رنگ" پھیکا پڑتا نظر آتا ہے اور اس کی جگہ فارسی اسلوب کی پذیرائی کا احساس موجود ہے۔ کہیں کہیں مقفّیٰ جملے بھی موجود ہیں۔ لیکن میراں یعقوب کی نثر کا بنیادی وصف سادگی و بیساختگی، شگفتگی اور وضاحت ہے۔ "شمائل الاتقیاء" دکن کی بامحاورہ نثر میں قلمبند کی گئی ہے۔ یہ تصنیف اُردو نثر کے ارتقاء میں جدید وقدیم کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب ہم برہان الدین جانم کی نثر سے اس کا موازنہ کرتے ہیں تو دو مختلف ادوار کی نثر نگاری کی خصوصیات اور ان کے خدوخال کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" میں بقول نذیر احمد فارسی اور دکنی ایسی گھلی ملی ہیں کہ اس طرح کے رسالے بہت کم دیکھنے میں آئیں گے[10]۔ "کلمۃ الحقائق" میں کہیں پورا جملہ فارسی میں لکھا گیا ہے تو کہیں فارسی جملے میں چند مقامی الفاظ شامل کرکے مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض فقروں میں الفاظ فارسی لائے گئے ہیں۔ کہیں سوال دکنی میں ہے اور جواب فارسی میں۔ کہیں فارسی اور دکنی دونوں کا پہلو بہ پہلو استعمال کیا گیا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" پر بقول جمیل جالبی "گجری اردو" کا رنگ غالب ہے[11]۔ خود جانم نے اپنی زبان کو "گجری" سے موسوم کیا ہے۔ دکن میں نثر کا آغاز خانوادۂ شمس العشاق کا کارنامہ ہے۔ امین الدین اعلاء، میراں جی خدانما اور میراں یعقوب کی کاوشیں اسی نثری روایت کی کڑیاں ہیں۔ بعد کی تصانیف میں "کلمۃ الحقائق" سے زیادہ فارسی اسلوب کی پذیرائی اور اخذ وقبول کا احساس ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر دکنی زبان کا مزاج اور اس کے لسانی خدوخال نمایاں ہیں۔ جب ہم جانم کی نثر کا، دورِ مابعد کے مصنفین کی عبارتوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ اظہار وبیان میں زیادہ توانائی وہمہ گیری اور زبان میں زیادہ قوت وحرارت کا احساس ہوتا ہے۔

دکنی نثر کا نیا رنگ وآہنگ وجہی کی دین ہے۔ یہ اسی صاحبِ طرز ادیب کا کارنامہ ہے کہ قدیم ڈگر سے ہٹ کر نثر ادبی معیاروں کی طرف گامزن ہوئی اور تصوف ومذہب کے بندھے ٹکے موضوعات کے راستے سے ہٹ کر داستان وتمثیل کی روش اختیار کی۔ وجہی کی زبان اپنے متقدمین کی زبان سے زیادہ صاف، سلیس، پراثر، رنگین اور دلآویز ہے۔ وجہی نے برہان الدین جانم کی طرح اپنی زبان کو گجری نہیں کہا ہے۔ بلکہ وہ اسے "زبانِ ہندستانی" سے تعبیر کرتا ہے اور "گوالیار کے چارّاں" سے اپنی انشاپردازی کی داد چاہتا ہے۔ گولکنڈے کی شاعری اور نثر میں بیجاپور کی ادب سے زیادہ فارسیت کا عنصر گھل مل گیا تھا۔ وجہی کی "سب رس" میں گولکنڈے کے مخصوص ادبی مزاج کی ترجمانی ملتی ہے اور فارسی اسلوب وآہنگ اور لب ولہجے کا اثر نمایاں ہے۔ قدیم دور میں ابلاغ واظہار کا بنیادی ذریعہ شاعری تھی اور اس میں ہر طرح کے موضوعات ادا کرنے کی صلاحیت اور گنجائش موجود تھی لیکن نثر کا مرتبہ اس سے کمتر سمجھا جاتا تھا۔ جانم، امین الدین اعلاء، میراں جی خدانما اور میراں یعقوب وغیرہ کی تصانیف نے اردو نثر کی تشکیل وتعمیر میں اہم حصہ لیا ہے۔ ان کے کارنامے دکن میں اردو نثر کے ارتقائی دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وجہی کا طرزِ تحریر ان سب سے مختلف ہے۔ یہ اسلوب معیاری نثر سے قریب نظر آتا ہے اور دکن میں عبارت آرائی اور انشاپردازی کا پہلا نمونہ ہے۔ "سب رس" قدیم نثر کا سب سے درخشاں کارنامہ ہے جو اردو نثر کے سفر میں ایک نئی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ بظاہر ایک عشقیہ داستان معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں مثالیہ کی تمام ایمائیت اور معنویت موجود ہے۔ "سب رس" کے حسین ودل نشین اسلوب نے اسے قدیم نثر کی ایک معرکۃ الآرا تخلیق بنادیا ہے۔ "سب رس" میں مختلف موضوعات جیسے عورت، شراب، حسن، عشق اور ریا وغیرہ پر وجہی نے جہاں اظہار خیال کیا ہے ان عبارتوں میں ہم انشائیہ کے اولین نقوش تلاش کرسکتے ہیں۔ "سب رس" صرف انشاپردازی کی ایک اعلا مثال نہیں بلکہ انشائیہ نما تحریروں کا بھی پہلا نمونہ ہے۔

"سب رس" قدیم نثر کی سب سے بلند پایہ اور قابلِ قدر تخلیق ہے۔ اسے گولکنڈے کی نثر کا بہترین نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ "سب رس" کی مقفیٰ اور مسجع عبارتیں، پر تکلف نثر، پر آہنگ اور مترنم فقرے، تشبیہات واستعارات سے عبارت کے حسن میں اضافے کی کوشش اور موضوع کی اہمیت ومعنویت اور اس کی رمزیاتی و تمثیلی پیش کش نے اُسے دکنی نثر کا ایک قابلِ فخر کارنامہ بنادیا ہے۔ صوری اور معنوی حسن کا مناسب اور موزوں امتزاج ادب پارے کی عظمت و وقعت کا ضامن ہوتا ہے اس لیے محض قافیہ آرائی اور مقفیٰ و مسجع عبارتوں کی ظاہری چمک دمک اور مصنوعی آرائش کسی نثر پارے کو سدا بہار عظمت و رفعت عطا نہیں کرتی بلکہ موضوع کی معنویت و تہہ داری و گیرائی اور اس کا آفاقی پہلو اُسے گرانقدر بنادیتا ہے۔ "سب رس" صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے قدیم ادب کا ایک ان مٹ نقش ہے۔ اس لیے وجہی کا دعوا کہ "آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت، اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کر نہیں بولیا۔[12]" بے بنیاد اور کھوکھلا نہیں معلوم ہوتا۔

بیجاپور کے ادبی سرمایے میں نثر کے اعلا نمونوں کا فقدان نظر آتا ہے۔ شعرائے بیجاپور نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر مثنوی غزل اور دوسری اصنافِ سخن میں دکھائے تھے اور بیجاپوری ادب کی عظمت تسلیم کروائی تھی لیکن نثر کی طرف اربابِ علم وفن نے زیادہ توجہ نہیں کی اور اسے صرف تبلیغ واشاعت کے وسیلے اور ہدایت وتلقین کے ذریعے کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا رہا۔ بیجاپور کے دورِ اوّلیں کی نثر کے نمونے لسانی اور ادبی ارتقاء اور نشو ونما کی رفتار کا اندازہ لگانے میں ہماری مدد کرتے ہیں اور ان کی تاریخی ترقی کا خاکہ متعین کرتے ہیں۔ بیجاپور نثر کا دائرہ مذہب، تصوف اور اخلاق کے مسائل تک محدود تھا۔ وجہی دبستانِ گولکنڈہ کا وہ پہلا انشا پرداز ہے جس نے ادبی بنیادوں پر نثر نگاری کی۔ اس کی تحریریں محض پند وموعظت کی ترجمان نہیں بلکہ ان میں پہلی بار ادبیت کی شان نظر آتی ہے اور انشا پردازی کی سحر آفرینی کا احساس ہوتا ہے۔ بیجاپوری ادب کا کوئی ایسا نثری نمونہ ہنوز ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد عابد شاہ کی "معالجاتِ بندہ نواز"، "کنز المومنین"، "مخزن السالکین" یا "گلزار السالکین" اور مراۃ السالکین" کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ گولکنڈہ کے دورِ آخر میں اردو نثر اس قابل ہوگئی تھی کہ اسے ترسیل کا ذریعہ بنایا جاسکے۔ "معالجاتِ بندہ نواز" علمِ طب سے متعلق ہے اور "مراۃ السالکین" میں تصوف وفلسفے کے بعض مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔ "کنز المومنین" کی تصنیف کے لیے عابد شاہ نے چوبیس کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی عبارتوں پر قدامت کی چھاپ بڑی ہلکی ہے اور انھوں نے اپنی زبان کو "دکھنی" سے تعبیر کیا ہے ۔

شروع جو کیا ہوں یو دکھنی کتاب
یو اتمام جلدی سوں ہوئے شتاب

عابد شاہ کی نثر کے تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ جدید لفظ قدیم لغات کی جگہ لے رہے تھے۔ عابد شاہ نے لفظوں کے قدیم روپ کے ساتھ ان کی جدید شکلیں بھی استعمال کی ہیں مثلاً ان کی تحریروں میں حرفِ عطف "ہور" بھی موجود ہے اور اس کا جدید مترادف "اور" بھی استعمال کیا گیا ہے۔ "گلزار السالکین" میں کہیں کہیں انشا پردازی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

حواشی:-

1. محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص300۔
2. مسعود حسین خاں۔ پیش لفظ۔ مغز مرغوب وچہار شہادت۔ ص4۔
3. شمس اللہ قادری۔ اردو ے قدیم۔ ص116۔
4. حامد حسن قادری۔ داستانِ تاریخ اردو۔ ص34۔
5. نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ باب چہارم الف۔ ص215۔
6. اکبر الدین صدیقی، مقدمہ کلیۃ الحقائق۔ ص9۔
7. مسعود حسین خاں۔ پیش لفظ مغز مرغوب وچہار شہادت۔ ص5۔
8. جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص307۔
9. حفیظ قتیل، تمہید کتاب میراں جی خدانما ص2۔
10. نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ باب چہارم الف۔ ص234۔
11. جمیل جالبی۔ تاریخ ادبیات پاکستان وہند۔ ص397
12. سب رس۔ مرتبہ عبدالحق ص11

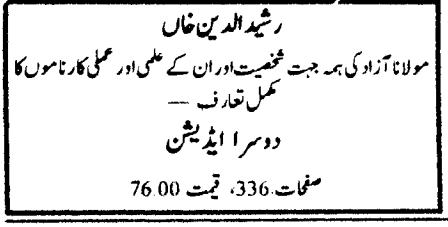

رشید الدین خاں

اردو انسائیکلو پیڈیا جلد سوم سے اقتباس

کہکشاں

کہکشاں ستاروں کا وہ وسیع نظام ہے جو پوری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ کہکشاں کی نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل چار عنوانات سے واضح کی جاسکتی ہیں: (1) ہماری کہکشاں، (2) دیگر کہکشاں، (3) کہکشاں کے خوشے، (4) پھیلتی ہوئی کائنات۔

ہماری کہکشاں: ہماری کہکشاں جو آسمان پر بے شمار ستاروں کی پٹی سی دکھائی دیتی ہے، کم و بیش دس ہزار کروڑ یعنی 10^{11} ستاروں پر مشتمل ہے۔ ہمارا سورج (مع اپنے سیاروں اور ان کے توابع کے) ان ہی ستاروں کے جھنڈ کا ایک تارہ ہے۔ ہماری کہکشاں کو روز مرہ کی انگریزی میں Milky way اور ہندی میں "آکاش گنگا" کہتے ہیں۔ ان ستاروں میں سے کئی ایک ڈبرے (Double) اور متعدد یا ضعفی (Multiple) نجمی نظام بناتے ہیں یا بعض خوشوں (Clusters) میں مرتب ہیں۔

ستاروں کے یہ خوشے دو قسم کے ہوتے ہیں:

(1) کھلے خوشے جو ستاروں کے غیر پیوستہ جھنڈ ہیں۔ جن کی شکل غیر معین ہے اور جو عام طور پر نو عمر نیلے رنگ کے دیو پیکر ستاروں (Giant Stars) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان ستاروں کو آبادی اوّل کے ستارے بھی کہتے ہیں۔

(2) کروی خوشے جو ستاروں کے پیوستہ نظام ہیں۔ یہ خوشے کروی شکل کے یا ناقص نما (Ellipsoid) بھی ہوتے ہیں۔ ان خوشوں کے ستارے لال رنگ کے ضخام وہ ستارے ہیں جو نجمی ارتقاء کے لحاظ سے "عمر رسیدہ" یا آبادی دوم" کے ستارے بھی کہلاتے ہیں۔

ہماری کہکشاں نسبتاً چپٹے قرص کی شکل کی ہے جس کا قطر تقریباً ایک لاکھ نوری سال ہے۔ ایک نوری سال سے مراد وہ فاصلے ہے جو روشنی تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک سال میں طے کرتی ہے یعنی ایک نوری سال تقریباً 10^{13} کلو میٹر کے برابر ہوتا ہے۔

کہکشاں کے ستارے مرکز کہکشاں کے گرد تقریباً بیضوی مداروں پر گردش کرتے ہیں جس سے کہکشاں کا گھماؤ پیدا ہوتا ہے۔

ہماری کہکشاں کے مرکز سے تقریباً تیس ہزار نوری سال کے فاصلہ پر ہمارا سورج واقع ہے۔ مرکز کہکشاں کے گرد ہمارا سورج (مع اپنے سیاروں اور ان کے توابع کے) تقریباً 2×10^{8} یعنی بیس کروڑ سال کی مدت میں ایک گردش مکمل کرتا ہے۔

کہکشاں کی کمیت کا تقریباً 98 فی صدی اس کے ستاروں کی کمیتوں پر مشتمل ہے کیونکہ کہکشاں کی 2 فی صدی کمیت ستاروں کی درمیانی گیس (Gas) اور گرد (Dust) کی شکلوں میں موجود ہے۔ اس بین النجمی واسطے (Interstellar Medium) سے متعلقہ مقناطیسی میدان کی شدت سورج کے آس پاس تقریباً ایک گاوس کا لاکھواں حصہ 10^{5} ہے۔ کائناتی تخلیق میں بین النجمی واسطے کو بہت اہمیت حاصل ہے چونکہ اس کے مادے سے ہی ستارے وجود میں آتے ہیں۔

دیگر کہکشاں: جس طرح کہ کہکشاں کے تعمیری اجزا ستارے ہیں اسی طرح کائنات کے تعمیری اجزا کہکشاں ہیں۔ امریکی ہیئت داں ہبل (Hubble) نے جو کہکشاں سے متعلقہ تحقیقات کا بادی مانا جاتا ہے، کہکشاں کی بنیادی ساخت کے اعتبار سے تین اقسام دریافت کیں:

(1)	بیضوی کہکشاں	(Elliptical)
(2)	چکردار کہکشاں	(Spiral)
(3)	بے قاعدہ کہکشاں	(Irregular)

ان ساختوں کے ہر گروہ کی اندرونی وضع قطع کی تبدیلیوں کے لحاظ سے مزید ذیلی قسمیں کی جاتی ہیں۔ جن کہکشاں سے ہم واقف ہیں ان میں سے تین چوتھائی چکر دار ساخت کی ہیں۔ انھی میں ہماری کہکشاں بھی شامل ہے۔ چکردار اور بے قاعدہ کہکشاں بہت سے نو عمر ستاروں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان میں کافی بڑی مقدار میں بین النجمی گیس (Interstellar Gas) اور گرد (Dust) ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف بیضوی کہکشاں میں زیادہ تر عمر رسیدہ ستارے ہوتے ہیں اور گیس و گرد بہت کم یا بالکل نہیں ہوتی ہے۔ کہکشاں کی کمیتیں سورج کی کمیت کی ایک ہزار کروڑ 10^{10} تا پانچ لاکھ کروڑ 5×10^{12} گنی

● قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو انسائیکلو پیڈیا کی تین جلدیں شائع کی ہیں جن میں کلیدی مضامین شامل ہیں۔ مختصر نوشتوں کی مزید جلدیں پریس میں ہیں۔ پہلی جلد 300 روپے کی ہے۔ باقی دو کی قیمت 450 روپے فی جلد ہے۔ ان صفحات میں پیش ہے انسائیکلو پیڈیا جلد سوم سے اقتباس۔

ہوتی ہیں۔ سورج کی کمیت 2×10^{23} گرام ہے۔

نسبتاً قریب کی کہکشاں کے فاصلے ان میں واقع ہونے والے ایک خاص قسم کے ستاروں کی مدد سے جو قیقاوسی متغیر ستارے (Cepheid Variables) کہلاتے ہیں، محسوب کیے جاتے ہیں۔

ان قیقاوسی متغیر ستاروں کی روشنی یا تابناکی میں ایک باقاعدہ دوری تبدیلی ہوتی ہے۔ روشنی کی اس دوری تبدیلی کی مدت اور اس کی مطلق تنویر (Absolute Luminosity) میں ایک یکتا رشتہ ہوتا ہے۔ اس رشتے کی مدد سے کہکشاں کے فاصلے محسوب کیے جاتے ہیں۔ جو کہکشاں بہت دور واقع ہیں ان کے فاصلوں کا اندازہ لگانے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ کہکشاں خود یا ان میں کے روشن ترین ستارے کس قدر مدھم دکھائی دیتے ہیں۔ پھر فاصلہ معلوم کرنے کے لیے تنویر کا معکوس مربع کا کلیہ (Inverse Squarelaw) استعمال کیا جاتا ہے۔

کہکشاں کے خوشے: جس طرح کہ ہماری کہکشاں دہرے (Double) متعددہ یا ضخیم ستارے اور ستاروں کے خوشے پر مشتمل ہے، اسی طرح کہکشاں کے گروہ اکثر دہری اور متعدد کہکشاں اور کہکشاں کے خوشوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ متعددہ کہکشاں اکثر پلوں (Bridges) اور ریشوں (Filaments) کی شکل کے مادے سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں جس سے کہکشاں کے درمیانی مادے کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

ہماری کہکشاں ایک رکن ہے تقریباً 30 کہکشاں کے ایک گروہ کا، جو نام نہاد طور پر مقامی گروہ کہلاتا ہے اور جو تقریباً بیس لاکھ نوری سال قطر والی فضا پر پھیلا ہوا ہے۔ ہمارا قریب ترین ہمسایہ کہکشاں دو بے قاعدہ کہکشاں ہیں جو بڑا اور چھوٹا مجلانی بادل (Magellanic Clouds) کہلاتی ہیں۔ یہ کہکشاں ہماری کہکشاں سے تقریباً ایک لاکھ ساٹھ ہزار اور ایک لاکھ 90 ہزار نوری سال کی دوری پر واقع ہیں۔ مقامی گروہ کا ایک اور مشہور رکن ایک قابل دید چکردار کہکشاں ہے جو مسلسلہ کہکشاں Andromeda یا M31 کہلاتا ہے اور 15 لاکھ نوری سال کی دوری پر واقع ہے۔ دونوں مجلانی بادل اور مسلسلہ کہکشاں صرف تین کہکشاں ہیں جو ہماری کہکشاں کے باہر ہونے کے باوجود خالی آنکھ سے (یعنی دوربین کی مدد کے بغیر) دیکھی جاسکتی ہیں۔

خوشہ بندی (Clustering) کہکشاں کی کائنات کی ایک بنیادی خاصیت ہے۔ تقریباً دس رکن والے چھوٹے اور بہت بڑے کم از کم دس ہزار کہکشاں والے خوشے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ خوشے تقریباً دو زمروں (Categories) میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ (1) باقاعدہ یا باترتیب اور (2) بے قاعدہ یا بے ترتیب خوشے۔

باقاعدہ خوشوں کی خصوصیت کروی تشاکل (Symmetry) اور مرکزی اجتماع ہے۔ یہ بڑے وافر خوشے ہوتے ہیں اور ان کی ساخت ستاروں کے کروی خوشوں (Globular Clusters) کی سی ہوتی ہے۔ باقاعدہ خوشوں کی منور کہکشاں زیادہ تر بیضوی ہوتی ہیں۔ ضخام چکردار کہکشاں کا یا تو بالکل وجود نہیں یا وہ بہت کمیاب (Rare) ہیں۔ کہکشاں کا کوما خوشہ (Coma Cluster) جو ہم سے تقریباً 30 کروڑ (3×10^8) نوری سال کی دوری پر واقع ہے، باقاعدہ خوشے کی ایک مشہور مثال ہے۔

بے قاعدہ خوشے نمایاں کروی تشاکل یا مرکزی اجتماع نہیں رکھتے ہیں اور بظاہر ستاروں کے کھلے خوشوں جیسے نظر آتے ہیں۔ بے قاعدہ خوشے بڑے وافر خوشوں اور کہکشاں کے چھوٹے گروہوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بے قاعدہ خوشوں کی منور کہکشاں بیضوی یا چکردار ہو سکتی ہیں۔ کہکشاں کا مشہور خوشہ عذرا یا سنبلہ (Virgo Cluster) اور مقامی کہکشاں کے گروہ (Local Group) بے قاعدہ خوشوں کی مثالیں ہیں۔ بے قاعدہ خوشے باقاعدہ خوشوں سے تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔

کہکشاں میں ستاروں کے باہمی فاصلے بہ مقابل ستاروں کی جسامت کے اس قدر بڑے ہیں کہ دو ستاروں کی باہمی ٹکر کا امکان بہت کم ہے اور نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ تاہم کہکشاں کے ایک خوشے میں آس پاس کے مختلف کہکشاں کا درمیانی فاصلہ کہکشاں کے قطر کے پانچ گنے سے کچھ ہی بڑا ہوتا ہے۔ چونکہ کہکشاں ایک دوسرے کو تجاذبی قوت سے کھینچتی ہیں اور خوشے کے اندر اپنی ذاتی حرکت برقرار رکھتی ہیں اس لیے کہکشاں کی آپس میں ٹکر کا امکان کم نہیں ہے۔ کہکشاں کی ٹکر میں دو کہکشاں کا بین النجمی مادہ شدت کے ساتھ باہمی عمل پذیر ہوتا ہے اور ان کہکشاں کے باہر کہکشاں کی درمیانی فضا میں نکل پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ٹکر کھانے والے کہکشاں کے ستاروں میں مدوجزری عمل (Tidal Action) کی وجہ سے اسراع پیدا ہو سکتا ہے اور ان ستاروں کا ایک چھوٹا فی صد حصہ اتنی بڑی رفتار حاصل کر سکتا ہے کہ وہ ان کہکشاں سے باہر نکل جائے۔ 20 کروڑ (2×10^8) نوری سال کے فاصلے پر طاقتور ریڈیائی منبع (Radio Source) جو تارامنڈل دجاجہ (Cygnus Constellation) میں واقع ہے دراصل کہکشاں کا ایک جوڑا ہے جن میں بہت قریبی ٹکر ہوتی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔

کہکشاں کے طیفی تجزیے (Spectral Analysis) سے حاصل ہونے والی کہکشاں کی رفتاروں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ عام طور پر

کسی خوشے کے مرکزِ کیت (Centre of Mass) کی رفتار کی بہ نسبت کہکشاں کی رفتاریں اس قدر ہیں کہ خوشے کو منتشر (Disintegrate) ہو جانا چاہیے سوائے اس صورت کے کہ کہکشاں کے درمیان مادہ کی ایک بڑی مقدار موجود ہو جو خوشے کو تجاذبی قوت سے پکڑ رکھنے کے لیے اور حرکیاتی قائمیت (Dynamical Stability) پیدا کرنے کے لیے کافی ہو۔ تاہم فی الحال ہمیں مشاہدات کی بنا پر شہادتیں حاصل نہیں ہوئی ہیں جن کی رو سے کہکشاں کے درمیان کافی بڑی مقدار میں مادے کا وجود ثابت ہو سکے۔

پھیلتی ہوئی کائنات: از حد دور کی کہکشاں کے طیوف (Spectra) کا معائنہ کرنے پر جیسے رواں شدہ کیلشیم (Ionized Calcuim) کے اور امتیازی طیفی خطوط (Characterstic) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام خطوط طیف کے سرخ سرے کی طرف ہٹے ہوئے ہیں۔ 1929ء میں ہبل (Hubble) نے ایک بہت اہم دریافت کی یعنی یہ کہ جیسے جیسے (ہم سے) کہکشاں کے فاصلے بڑھتے ہیں ویسے ویسے ان کے طیوف کا سرخ ہٹاؤ (Red Shift) بھی بڑھتا ہے۔ اگر سرخ ہٹاؤ کی یہ تعبیر لی جائے کہ وہ ڈاپلر اثر (Doppler Effect) کا نتیجہ ہے (اور یہی سب سے زیادہ معقول تعبیر معلوم ہوتی ہے) تو مشاہدات یہ بتاتے ہیں کہ تمام کہکشاں ہم سے دور ہٹتی جا رہی ہیں۔ ایسی رفتاروں سے جو ان کے فاصلوں سے متناسب ہیں۔ ایک کہکشاں کی ہم سے دور ہٹنے کی رفتار کو رفتارِ رجعت (Recession Velocity) کہتے ہیں۔ اس رفتار اور کہکشاں کے فاصلے کے مابین تناسب ہبل کا مستقل (Hubble's Constant) کہلاتا ہے۔ اس کی آج کل عام طور پر مانی ہوئی موجودہ قدر پچاس کلومیٹر فی سیکنڈ فی دس لاکھ پار سیک (Parsec) ہے۔ ایک پار سیک 3.262 نوری سال فاصلے کے برابر ہوتا ہے یعنی یہ وہ فاصلہ ہے جس پر ایک فلکی جرم کا سالانہ اختلافِ منظر (Parallax) ایک سیکنڈ کے زاویے کے برابر ہوتا ہے۔

فضا میں تمام سمتوں میں کہکشاں کی رجعت کے مظہر کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام کہکشاں اور کہکشاں کے خوشے بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کائنات پھیل رہی ہے۔ اس مظہر کے لیے توسیعِ کائنات (Expansion of Universe) کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔

پھیلتی ہوئی کائنات کا تصور قابلِ مشاہدہ کائنات (Observable Universe) کی جسامت کو محدود کرتا ہے۔ کیوں کہ خاص نظریۂ اضافیت (Spacial Theory of Relativity) کی رو سے ہم کہکشاں کا مشاہدہ صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں جب کہ ان کی رجعی رفتاریں روشنی کی رفتار سے کم ہوں۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ہبل کا مستقل فاصلوں کے ساتھ کسی قدر نہیں بدلتا ہے تو بعید ترین قابلِ مشاہدہ کہکشاں کی رجعی رفتار نور کی رفتار 3 لاکھ کیلومیٹر فی سیکنڈ کے مساوی ہوگی۔ اس حساب سے یہ کہکشاں تین سو کروڑ ($3x\ 10^9$) پار سیک کی دوری پر ہوں گی۔ بالفاظِ دیگر ایک ہزار کروڑ نوری سال کا یہ فاصلہ قابلِ مشاہدہ کائنات کا نصف قطر تصور کیا جا سکتا ہے۔ اب تک کہکشاں کی رفتاریں روشنی کی رفتار کے نصف کی حد تک مشاہدے میں آئی ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ قابلِ مشاہدہ کائنات میں کہکشاں کی تعداد تقریباً 10^{11} کے برابر ہے جس سے ستاروں کی کل تعداد 10^{21} بنتی ہے۔

اہلِ اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر

اردو انسائیکلوپیڈیا

جو بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے ۔ ۳۲ علوم پر مشتمل تین کلیدی جلدیں شائع ہو گئیں

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ ابتدائی تین جلدیں ۳۲ علوم پر مشتمل ہیں۔ جملہ علوم پر مختصر نوشتے آٹھ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشین پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔

جلد اوّل، 578 صفحات، قیمت-/300روپے۔ جلد دوم، 568 صفحات، قیمت-/450روپے۔ جلد سوم، 614 صفحات، قیمت-/450روپے

مندرجہ ذیل پتے پر لکھیں یا کسی کتب فروش سے حاصل کریں ۔ قومی اردو کونسل، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

امتیاز عالم

میڈیکل ٹرانسکرپشن

(Medical Transcription)

ترقی اور مواقع کے اس دور میں روزگار اور کیریئر کے بے شمار ذرائع آج خود ہمارے ملک میں نئی نسل کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ روز بروز نئی جہتیں سامنے آرہی ہیں، اطلاعاتی ٹکنالوجی (IT) پر منحصر سروس سیکٹر (خدمتی شعبہ)، "میڈیکل ٹرانسکرپشن" انھی میں سے ایک ہے۔ اس کی حیثیت آج باقاعدہ ایک انڈسٹری کی ہے جو اپنی نوعیت اور اہمیت کے پیش نظر ہمہ گیریت اختیار کرتا جارہا ہے۔ ناسکوم کے ایک تخمینے کے مطابق یہ انڈسٹری 2008ء تک تقریباً 2 لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرسکتی ہے جس سے شرح آمدنی گیارہ ہزار کروڑ تک متوقع ہے۔

میڈیکل ٹرانسکرپشن (M.T) وہ عمل ہے جس کے ذریعے بآسانی ڈاکٹر یا کسی اور فرد کے ذریعے املا کرائے گئے/بولے گئے میڈیکل ریکارڈس مثلاً مرض کی تاریخ، طبی رپورٹ، مطب نوٹ، آفس نوٹ ڈسچارج کی تفصیلات، ایکس رے رپورٹ، لیبارٹری رپورٹ اور اسی طرح کی دیگر رپورٹس کی ہو بہو نقل کی جاتی ہے انشورنس کمپنیاں چوں کہ 95% فی صد میڈی کیئر بل کی ادائیگی کرتی ہیں لہٰذا حفظانِ صحت کے تمام ہی مرحلے کے دستاویزوں کی پوری حفاظت ضروری ہوتی جارہی ہے، بدعنوانی اور لاپرواہی کی شکایت کے خلاف قانونی چارہ جوئی میں ڈاکٹر اس کی مدد سے خود کو بآسانی بری ثابت کرپاتے ہیں۔

گذشتہ تیس سالوں سے "ایم ٹی" امریکہ میں ایک کامیاب پیشے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، برقی ذرائع ترسیل کے میدان میں جدید اور معیاری سہولیات کے پیش نظر 1992ء میں ایک امریکی نے اس پیشے کی وسعت پر سنجیدگی سے غور کیا وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ پیشہ دنیا کے کسی بھی ملک میں شروع کیا جاسکتا ہے۔ آج خود امریکہ کے بالمقابل ہندستان میں ایم ٹی کے لیے ایک وسیع فضا ہموار ہوگئی ہے اور اس کا مستقبل زیادہ واضح ہوتا نظر آرہا ہے۔ ایک امریکی ایم ٹی کی سالانہ تنخواہ 30 ہزار ڈالر ہے جبکہ ایک تجربہ کار ہندستانی پر سالانہ صرف تین ہزار ڈالر کی لاگت آتی ہے۔ منافع کے اس زبردست فرق نے ہندستان میں اس پیشے کے مستقبل میں وسیع تر امکانات کو جنم دیا ہے۔ آج اچھی کمپنیاں روز بروز سرمایہ کاری کے لیے آگے آرہی ہیں۔ انٹرنیٹ اور برق رفتار سسٹم کی آمد سے ڈاکٹر اپنے پاس میکروفون رکھتا ہے جو کمپیوٹر سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ فائلیں یو ایس کے مختلف ڈاکٹروں سے ایم ٹی کانٹرکٹرس حاصل کرتے ہیں اور انھیں انگریزی بولنے اور سمجھنے والے ممالک مثلاً ہندستان اور پاکستان بھیج دیتے ہیں۔ اور پھر آخری مرحلے تک کی جملہ کارروائی یہیں مکمل کرکے انھیں واپس متعلقہ پارٹی کو واپس کردیا جاتا ہے۔

میڈیکل ٹرانسکرپشن کی زبان انگریزی ہے۔ اس پیشے میں کیریئر بنانے کے لیے آپ کے اندر سننے اور سمجھنے کی اچھی استعداد ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی میڈیسن (ادویہ) کے تمام ہی گوشوں سے متعلق اصطلاحات کی جانکاری بھی ضروری ہے، اگر کوئی اصطلاح غیر مانوس ہے تو بحیثیت ایک پیشہ ور ایم ٹی۔ کے آپ اس لفظ کے صحیح معنی کی تلاش کریں جو اس مخصوص رپورٹ کے تناظر میں پوری طرح فٹ ہوسکے، حوالہ کتب (Reference Books) کا استعمال آپ کرسکیں، علم الابدان اور علم الاعضاء کے وسیع اور ہمہ گیر مضمون اور اصطلاحوں پر آپ کی نظر ہو، ساتھ ہی کمپیوٹر اور میڈیکل اصطلاحات سے واقفیت ہو۔ بطور خاص لیبارٹری، جراحی وغیرہ سے متعلق اصطلاحات و مخففات، منتخب الفاظ کی فہرست، میڈیکل جرنل اور کمپیوٹر نیٹ ورک بھی تازہ اور جدید ادویہ اور اصطلاحات کی تفہیم میں معاون ہیں۔ کمپیوٹر کے میڈیکل Spell Checker اور مخففات سسٹم کی مدد سے پیشے پر گرفت مضبوط کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کی بورڈ (Key Board) پر آپ کی معقول اسپیڈ ہو، لمبے وقفے تک کام کرنے کی صلاحیت، ساتھ ہی غایت درجہ کا انہماک بھی ہو۔

اس پیشے میں کیریئر شروع کرتے وقت آپ کسی مستند ادارے سے بارھویں یا گریجویٹ ہوں۔ مختلف ادارے ایم ٹی کورس بھی کراتے ہیں جن کی مدد سے اس میدان میں کیریئر شروع کیا جاسکتا ہے ان میں انگلش گرامر، رموز واوقاف، علم الاعضاء اور علم الابدان، امراض کے مختلف مراحل، علم الادویہ، لیبارٹری میڈیسن، ابتدائی اور معیاری میڈیکل زبان / ٹیکنالوجی، حفظانِ صحت ریکارڈس، طبی قانون اور اخلاقی امور، مطلوبہ پیشہ ورانہ استعداد وغیرہ موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے جن کی مدد سے ایک سنجیدہ پیش رفت ممکن ہوسکتی ہے۔ چند معروف ادارے درج کیے جاتے ہیں:

1۔ شوم انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ٹرانسکرپشن ڈی، 53 اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیزون، نئی دہلی20،
فون 6813643/44/45

2۔ کھیتان انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی کھیتان پبلک اسکول1A/A سیکٹر40، نوئیڈا(یوپی)

3۔ کِٹکو(Kitko)ای10ساؤتھ ایکسٹنشن۔1، نئی دہلی49

4۔ ٹرانس ہوم411 بہرا انکلیو پچھم وہار نئی دہلی۔

5۔ ITES، 3/7 سی پرشانت وہار، روہنی دہلی۔85

مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ آج بے شمار ادارے ہیں جہاں ایم ٹی کی معقول تربیت کا نظم ہے۔ یہ ادارے وظائف بھی دیتے ہیں لہٰذا اگر آپ کا انتخاب وظائف کے ساتھ ہو جاتا ہے تو بہت معمولی اخراجات میں آپ تربیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس فیلڈ میں کیریئر کے لیے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ براہِ راست ایم ٹی کمپنیوں میں روزگار کے لیے انٹرویو دیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کمپیوٹر پر کم از کم 40 کی اسپیڈ سے ٹائپ کر لیتے ہوں اور انگریزی زبان کی شد بدھ ہو یعنی آپ سن کر ٹائپ کر سکتے ہوں۔ چوں کہ آج نئی کمپنیوں کو بہت کم تربیت یافتہ افراد دستیاب ہیں لہٰذا وہ مذکورہ اہلیت کے لوگوں کا انتخاب کر کے انھیں خود تربیت دیتی ہیں۔ ایسی کمپنیاں خود داخلی تربیت کا نظم رکھتی ہے۔ ایک مکمل ایم ٹی کمپنی کا تصور مارکیٹ میں یہ ہے کہ وہ خود کفیل ہو، داخلی تربیت کا نظم ہو، اس کی فیکلٹی تعلیم یافتہ اور تجربہ کار ہو، اپنے تربیت یافتہ افراد کو خود روزگار فراہم کرتی ہو، ساتھ ہی ضرورتاً دوسری کمپنی کو بھی افرادی مدد کرنے کی اہل ہو، لائبریری، لیب اور جدید سافٹ ویر ٹریننگ پروگرام کی سہولیات مہیا کراتی ہو اور فارغین کی گذشتہ کارکردگی کی پوری ریکارڈس رکھتی ہو۔ ان خصوصیات کی حامل کمپنیوں کا سب سے خوشگوار پہلو یہ ہے کہ ٹریننگ کے دوران آپ کی حیثیت ایک باقاعدہ ملازم کی ہوگی اور آپ پوری تنخواہ کے مجاز ہوں گے۔

روزگار کے مواقع ہاسپٹل، کلینک، فزیشین آفس، ٹرانسکرپشن سروس، انشورنس کمپنی اور ہوم کیئر ایجنسیوں میں دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ایم ٹی اپنے گھروں پر ہی ایک خود کفیل کانٹرکٹر اور کچھ ہوم بیس ملازم(Home base Employees) کی حیثیت سے کام کرتے ہیں ایک تجربہ کار ایم ٹی -/15000 ماہانہ حاصل کر سکتا ہے۔ آمدنی کا انحصار آپ کی اپنی استعداد پر ہے کہ آپ یومیہ کتنا مواد نقل کر پاتے ہیں۔ یاد رہے کہ 98.5 فی صد درستگی (Accuracy) اس پیشے میں عام بات ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ٹرانسکرپشن کے ڈائرکٹر۔ یویک گور کے بقول "بحیثیت ایک ایم ٹی کے آپ کی تعلیم کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ کسی ٹریننگ اسکول سے فراغت کے بعد یہ اس کی شروعات ہے۔ ایک کامیاب ایم ٹی تعلیم کے اس تسلسل سے لطف اندوز ہوتا ہے جو کہ پیشے کا ایک لازمہ ہے۔ ایسا ہی شخص پیشہ ورانہ فضا میں مقابلے کی شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے"۔ لہٰذا اس پیشے میں سیکھنے اور پھر آگے بڑھنے کا عمل مسلسل قائم رہتا ہے۔

ایک کامیاب ایم ٹی جو اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو وسعت دینا چاہتا ہے اس کے لیے بھی ترقی کے دروازے کھلے ہیں، وہ شعبے کا ہیڈ ہو سکتا ہے، سپروائزر، منیجر یا پھر ایم ٹی سروس کا مالک ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تجربہ کار جو میڈیکل لسانیات میں مہارت رکھتا ہے اسکول، کالج میں استاد ہو سکتا ہے یا پھر ایم ٹی اداروں میں تربیت دے سکتا ہے۔

بارھویں یا گریجویشن کے بعد گھر بیٹھ کر روزگار کے لیے سوچنے کی اب بالکل ضرورت نہیں، ایم ٹی کے دروازے اُن حوصلہ مند اور محنتی نوجوانوں کے لیے کھلے ہیں جن میں کچھ کر گزرنے کا فطری جذبہ موجود ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی جگہ متعین کر سکتے ہیں۔

M. Imteyaz Alam
WG (Manish Verma-PRD)
Tech Book Electronic(P) Ltd
B-60, Okhla Industrial Area Phase-1
New Delhi-110020

جوابات اردو ادب کوئز11

1-(الف)	2-(الف)	3-(ب)	4-(ج)
5-(ب)	6-(ج)	7-(ب)	8-(الف)
9-(ب)	10-(الف)	11-(د)	12-(ج)
13-(الف)	14-(ج)	15-(الف)	16-(ج)
17-(ج)	18-(الف)	19-(د)	20-(الف)
21-(ج)	22-(ب)	23-(ج)	24-(ب)
25-(ب)	26-(الف)	27-(الف)	28-(ب)
29-(الف)	30-(ب)	31-(د)	32-(الف)
33-(ج)	34-(ب)	35-(ب)	36-(ب)
37-(الف)	38-(ب)	39-(الف)	40-(ب)
41-(ج)	42-(الف)	43-(الف)	44-(ج)
45-ج	46-(الف)	47-(د)	48-(د)
49-(الف)	50-(ب)	51-(الف)	52-(ب)

سلمان عابد

کیریئر گائیڈنس

بیرونی ممالک میں تعلیم — ویزا — اسکالرشپ

سمندر پار حصول علم کس کی خواہش نہیں ہوتی۔ قدیم زمانوں سے یہ خواہش ان لوگوں کو رہی ہے جو اپنے کیریئر کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔

بیرونی ممالک میں حصول علم کے اس رجحان کے پیچھے آمدنی اور اپنا کیریئر بنانے کا خوبصورت خواب ہے جس کی تکمیل کے وسائل وہاں مہیا ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں اکثر و بیشتر طالب علم صرف اپنا کیریئر بنانے اور کمانے جاتے ہیں۔ ان ممالک کے تعلیمی اداروں میں داخلہ تو صرف ملک میں داخلے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے بس۔ بہت کم فی صد ہی سہی ایسے طلبہ بھی ہیں جو علم اور روزگار ساتھ ساتھ حاصل کرنے کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔

ہم یہاں تین اہم سوالات سے بحث کریں گے۔ ایک یہ کہ بیرونی ممالک میں داخلے کے لیے کیا کرنا ہوگا، کس طرح آگے بڑھنا چاہیے۔ کہاں کہاں ربط پیدا کرنا ہوگا۔ دوسرے بیرونی ممالک کے ویزے کتنے قسم کے ہیں، اور ان کا حصول کس طرح ہو۔ تیسرے بیرونی ممالک میں تعلیم اور روزگار کے کیا مواقع ہیں اور کیسے انھیں حاصل کیا جائے۔

برطانیہ برطانیہ کی تعلیم کی شروع ہی سے مانگ رہی ہے۔ وہاں حصول علم سے قبل ہماری اپنی ڈگریاں کس شعبے کی اعلا تعلیم کے لیے اہلیت کی حامل ہیں اس کی جانچ ہمیں قبل از وقت کروانا ہوتی ہے۔ یہاں ریگولر اور سینڈوچ کورس فراہم ہیں۔ ریگولر کی بہ نسبت سینڈوچ کورسس میں داخلہ آسان ہوتا ہے۔ بعض جامعات میں بیچلرس ڈگری کورس کی مدت چار سال ہوتی ہے۔ کورسس کی تفصیل اور داخلوں کے قواعد وغیرہ سے متعلق ان ویب سائٹ سے بھی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ www.britishcouncil.orgIndia; www.ucas.ac.uk.access

نیوزی لینڈ: یہاں آٹھ یونیورسٹی اور 20 پالی ٹکنک واقع ہیں۔ یہاں تعلیمی اخراجات دوسرے ممالک کی بہ نسبت کم ہیں اور یہاں کی تعلیمی اسناد تیسری دنیا کے روزگار مارکیٹ میں نہ صرف قابل قبول ہیں بلکہ ان کی مانگ بھی ہے۔ New Zealand Qualifications Authority (NZQA) نے تعلیمی معیار پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ ہندستانی طلبہ کے ساتھ نیوزی لینڈ کے تعلیمی اداروں اور تعلیمی داخلوں کے نمائندہ ٹرائی شیاریڈے (Tricia Reade) New Zealand's India Education Export Network, اپنے ملک میں طلبہ کے داخلے کے لیے ہر طالب علم سے انفرادی طور پر کونسلنگ کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ہندستانی طلبہ میں یہاں کے بزنس اسٹڈیز، آئی ٹی / کمپیوٹنگ، انجینئرنگ، ڈیزائن، وغیرہ کے کورس کافی مقبول ہیں۔ بیشتر یونیورسٹیاں یہاں کی آل انڈیا سینئر سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کو انڈر گریجویٹ پروگراموں میں داخلے کے لیے قبول کرتی ہیں۔ تعلیمی ادارے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ 13 سال کی تعلیم تمام کی تمام انگریزی میں ہوئی ہو ورنہ TOEFL اسکور (500-550) یا پھر IELTS اسکور (5-6.5) کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ ٹیوشن فیس عام طور سے 12,000 NZ$ سے 22,000NZ$ ہوتی ہے۔ مزید تفصیلات اس پتے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

Trade Newzealand, Nava marg,
Chanakyapuri, New Delhi
Tel: 011-6883170

امریکہ دنیا بھر میں امریکہ ہر کسی کے لیے کشش رکھتا ہے۔ یہاں واقع تقریباً ساڑھے تین ہزار تعلیمی اداروں اور جامعات میں مختلف کورس فراہم ہیں۔ زیادہ تر انجینئرنگ، کمپیوٹر، سائنس، پری لا، پری میڈیسن، میرین بائیولوجی، آرکیٹکچر جیسے کورس کے لیے طلبہ میں زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ ہارورڈ، مساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MIT) برکلی، سٹان فورڈ اور کرنیل جیسی جامعات بالخصوص ہندستانی طلبہ کے لیے پُرکشش ہے۔ یہاں پوسٹ سیکنڈری ایجوکیشن 18 سال عمر کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یہاں کی گریجویٹ اسٹڈیز ہندستانی پی جی اسٹڈیز کے مساوی ہوتی ہے۔ یہاں کا تعلیمی سال عام طور پر 32 ہفتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور تعلیمی سال اگست / ستمبر میں شروع ہوتا ہے۔ داخلے کے لیے ایک سال قبل ہی سے داخلہ فارم وغیرہ کے اور خال کی کارروائی کرنا پڑتی ہے۔ عام طور پر اچھے تعلیمی پروگراموں کی ٹیوشن فیس 11 ہزار ڈالر سے 40 ہزار ڈالر کے درمیان ہوتی ہے۔ ریزرو بینک آف انڈیا نے ہر سال 30 ہزار ڈالر کی تعلیمی امداد بھی ہندستانی طلبہ کے لیے جاری رکھی ہے۔ یہاں داخلوں کے لیے درج ذیل امتحانات میں کامیابی (اچھا اور اعلا

اسکور کا لازمی ہے۔

ا۔ انڈر گریجویٹ کورسوں کے لیے۔

1- Scholastic Aptitude Test
2- Sat-1- Sat-2
3- ACT Assessment

II گریجویٹ سطح کے کورسس کے لیے۔

1- Graduate Record Examination (GRE) - General
2- Graduate Record Examination (GRE) - Subject
3- Test of Spoken English (TSE)
4- Graduate Management Aptitude Test (GMAT)
5- Michigon Test of English Language Profeciency (MTELP)
6- Millers Analegis Test (MAT)
7- Law School Admission Test (LEAT)
8- United States Medical Licencing Examination (USMLE)
9- Commission on Graduates of Foriegn Nursing Schools Examination (CGENS)

ویزا کے حصول میں آسانی اس وقت ہوتی ہے جب کم از کم ایک سال کے تعلیمی اخراجات کی امریکی اسپانسر شپ (کفالت) آپ کو حاصل رہے۔ یہ وہاں مقیم آپ کے کسی رشتے دار کی جانب سے یا دوست وغیرہ کی جانب سے ہو سکتی ہے۔ ویزا کے لیے دو سال کی مدت میں دو مرتبہ درخواست دی جاسکتی ہے، اور یہ تین کام کے ایام کے وقفے کے ساتھ ہو۔ ویزا ملنے میں آسانی اس وقت بھی ہوتی ہے جب پہلی بار سے بہتر اور زیادہ تازہ دستاویزات یا منسلکات درخواست کے ساتھ ہوں۔ اسٹوڈنٹ ویزا کے لیے عام طور سے طالب علم کا تعلیمی ریکارڈ اور بہتر سے بہتر اسکور ہی دیکھا جاتا ہے اور مالی حالت ضمنی ہوتی ہے۔

ویزا کی اقسام: امریکہ میں داخلے کے لیے 8 قسم کے ویزا فراہم ہوتے ہیں۔ ان میں گرین کارڈ، فیملی، نیشنل انٹرسٹ ویور، ایمپلائمنٹ اتھورٹی، وزیٹر، اسٹوڈنٹ، لاٹری ویزا وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن یہاں تعلیم اور روزگار سے متعلق ویزوں سے ذکر مقصود ہے۔ روزگار کی فراہمی سے متعلق ویزے دس قسم کے ہیں۔ H_1, H_2, H_3, L_1, E, J_1, o, p, NAFTA, Religious,...

H_1 ویزا کے لیے کم از کم بیچلرس ڈگری کامیاب ہوں، اور یہ امریکی بیچلرس ڈگری کے مساوی ہو، H_2 ویزا زرعی شعبے کی ملازمتوں سے متعلق ہے، H_3 ویزا کسی کمپنی کی جانب سے عارضی تربیت وغیرہ کے حصول سے متعلق ہے۔ L_1 ویزا ایک کمپنی یا کارپوریشن سے امریکہ میں تبادلے یا کمپنی کے امریکہ میں قیام کی ضرورت پر مبنی ہے۔ E ویزا سرمایہ کاروں سے متعلق ہے۔ J_1 ایکس چینج ٹریننی ویزا ہے، "O" ویزا، آرٹس، کھیل، بزنس یا ایجوکیشن وغیرہ کے ماہرین کے لیے دیا جانے والا ویزا ہے P ویزا بین الاقوامی سطح کے اتھلیٹک گروپ کو دیا جانے والا ہوتا ہے۔ اور NAFTA میکسیکن کنسیرین پیشہ وروں کو دیا جانے والا ویزا ہوتا ہے۔ HiB ویزا ہی ان تمام میں ہمارے مطلب کا ہوگا کہ طلبہ یہی حاصل کرنا چاہیں گے۔ اس کے حصول کے لیے لازم ہے کہ امریکہ میں مسلمہ مساوی بیچلرس ڈگری ہمارے پاس ہو۔ روزگار کی پیشکش کرنے والے امریکی ادارے کو چاہیے کہ وہ ہماری تفصیلات ڈپارٹمنٹ آف لیبر میں Labour Condition Applica tion(LCA) داخل کرے، اور اس کی منظوری حاصل ہونے کے بعد 129-1 فارم، نان امیگرنٹ ورکرس پیٹشن، Hi سپلیمنٹ کے ساتھ منسلک کر کے امیگریشن اینڈ نیچر لائزیشن سروس (یا INS) دفتر میں داخل کیے جاتے ہیں۔ یہاں منظوری ملنے کے بعد امریکی قونصل خانے میں آخری منظوری کے لیے داخل کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام کارروائی امریکہ ہی میں کی جاتی ہے اور یہ تمام دفتری کارروائی ملازمت فراہم کرنے والی کمپنی اپنے طور پر کرتی ہے۔ یہ کارروائی آخری منظوری کے بعد جب ہمیں مل جاتی ہے تو پھر ہماری تمام اسناد یہاں سے روانہ کرنے کی باری آتی ہے۔ اس کے بعد مدراس یا دہلی میں امریکی سفارت خانے سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس ویزا سے امریکہ میں تین سال رہا جاسکتا ہے اور مزید توسیع ہو تو صرف چھے سال ہی رہا جاسکتا ہے۔

(F1) اسٹوڈنٹ ویزا کے لیے طالب علم کو درج ذیل ضروری امور کا لحاظ ضروری ہے۔

1۔ 20-1 یا IAP66 فارم، یہ امریکہ میں جس جگہ آپ پڑھنا چاہیں وہ ادارہ جاری کرتا ہے۔ 2۔ ویزا درخواست، 3۔ پاسپورٹ، 4۔ تصاویر، 5۔ درخواست فیس، 6۔ ویزا فیس۔ 7۔ GRE, TOEFL رپورٹ، 8۔ ڈگری اسناد، 9۔ اسناد مالیات۔

امریکی ایمبسی پیر سے جمعہ تک 8 بج کر 15 منٹ سے شام 5 بجے تک کام کرتی ہے۔ جمعرات ان کے لیے بہت زیادہ مصروف دن رہتا ہے چنانچہ طلبہ اس دن سے گریز کر سکتے ہیں۔ ویزا فارم وغیرہ امریکی ویب سائٹ سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (http://www. sphynx.com/madrassus) مزید تفصیلات چنائی میں واقع ایمبسی سے فون نمبر 2620-828 سے یا پھر اس پتے سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

United States Educational Foundation in India (USEFI)
Chennai, American Consulate General,
Mount Road, Chennai-600006
Tel 044-8273040

امریکہ، جاپان، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں ہندستانیوں کے

لیے اس سال سے ویزا کے لیے کئی آسانیاں فراہم کی جارہی ہیں۔ بالخصوص انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین، کمپیوٹر پروفیشنل کے لیے مذکورہ ممالک نے اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ حال ہی میں امریکی صدر بل کلنٹن نے دورۂ ہند سے واپسی کے بعد ایک خصوصی ویزا قانون کو منظوری دے دی ہے۔ اب قانون کی رو سے ہر سال H1 B ویزا کی تعداد 195,000 اگلے تین برس کے لیے بڑھادی گئی ہے۔ اور اس کا اطلاق اکتوبر سے کر دیا گیا ہے۔ اس قانون سے قبل ورنہ ویزا کی تعداد اس سال 107,500 اور اگلے برس کے لیے صرف 65000 تھی۔ ساتھ ہی ویزا فیس میں 500ڈالر سے 1000ڈالر کردی گئی ہے۔

مذکورہ اضافہ شدہ تعداد کا 47فی صد اندازہ کیا جارہا ہے کہ صرف IT Professionals کے لیے مختص کیا جائے گا۔

II اسکالرشپ۔

(الف) National Overseas Scholarships یہ اسکالرشپ بیرونی ممالک میں ماسٹر ڈگری PhD اور اس کے بعد تحقیق کے لیے ڈیڑھ سال سے 4 سالہ مدت کے لیے ان طلبہ کو دی جاتی ہے جن کا تعلق بے زمین زرعی مزدوروں اور روایتی فنون کے ماہرین خاندانوں سے ہے، بشمول ایس سی اور ایس ٹی۔ اسکالرشپ کے بطور تقریباً تمام ہی کورس، رہنا سہنا، قیام طعام اور کتابوں وغیرہ کے اخراجات دے دیے جاتے ہیں۔ عمر 33 سال کے اندر ہو، ماہانہ آمدنی 12 ہزار سے زائد نہ ہو، تعلیمی قابلیت میں لازمی ہے کہ بیچلرس ڈگری 60فی صد نمبروں سے کامیاب ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ مزید تفصیلات اور درخواست کے حصول وادخال کے لیے پتا ہے۔

Section Officer (SCD-V)
Ministry of Social Justice & Empowerment
Room No-240- A-Wing. Shastri Bhawan.
Dr. Rajendra Prasad Road, New Delhi-110001

(ب) Hindu- Hitachi Scholarships جاپان میں تربیت کے لیے یہ اسکالرشپ دی جاتی ہے۔ عمر 30 سال کے اندر ہو، بی ای یا بی ایس سی (انجینیئرنگ) یا اس کے مماثل کامیاب ہو، اگر طلبہ کو ڈگری کے ساتھ تجربہ ہو تو ترجیح دی جائے گی۔ یہ ٹیکنکل تربیت چھے ماہ کی ہوگی جو صرف تین طلبہ کے لیے ہوگی۔ چھے ماہ تک منتخب طلبہ کو پوری طرح ہٹاچی اسپانسر کرے گی۔ درخواست فارم اور دیگر تفصیلات اس پتے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یا پھر ہندو اخبار کے کسی بھی دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

The Hindu
859 & 860, Anna Salai- Chennai-600002

(ج) J.N. TATA Scholarships تقریباً تمام ڈسپلن میں اعلا تعلیم بیرونی ممالک میں حاصل کرنے کے لیے یہ اسکالرشپ اچھا تعلیمی ریکارڈ کے حامل گریجویٹس کے لیے فراہم ہے۔ جو سال آخر میں ہیں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔ پتا ہے

Chief Executive officer,
J N TATA Endowment, Bombay House,
24 Homi Mody Street. Mumbai-400001

III داخلے۔

(الف) Plantation Management میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس ایک سالہ مدت کا بنگلور میں فراہم ہے۔ اس کے لیے پروفیشنل اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ (PAT) 7/فروری 2001ء کو ملک کے مختلف مقامات پر ہوگا۔ 50فی صد نشانات سے کوئی بھی بیچلرس ڈگری کامیاب درخواست دے سکتا ہے۔ پتا ہے

Director
Indian Institute of Plantation Management(IIPM)
Janana Bharathi Campus. Malathalli,
Bangalore- 560056
Tel. 91-80-3211716
E-mail: sstipm@wipro.net.in
website. http://www.iipmb.com

(ب) انٹر کے بعد انفارمیشن ٹیکنالوجی کورس: انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی اینڈ مینجمنٹ گوالیار میں 10+2 کے بعد پانچ سالہ کورس فراہم ہے۔ اس کے لیے تحریری امتحان 28/اپریل 2001ء کو منعقد ہوگا۔ درخواست فارم اور تمام تفصیلات کے لیے اس پتے پر ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔

Chairman Admission
Indian Institute of Information Technology & Management
Gawalior (Website www.iiitm.ac.in)

(ج) ہیلتھ مینجمنٹ: ہاسپٹل مینجمنٹ اینڈ ہیلتھ مینجمنٹ میں دو سالہ پوسٹ گریجویٹ پروگرام جے پور میں قائم ادارے میں فراہم ہے۔ 50فی صد نشانات سے کسی بھی ڈسپلن میں گریجویٹ (سال آخر میں زیر تعلیم بھی) درخواست داخل کرسکتے ہیں۔ 100روپے کا ڈی ڈی ادارے کے نام روانہ کرکے درخواست حاصل کی جاسکتی ہے۔

Chairman (PGDHM)
Indian Institute of Health Management Research
Prabhu Dayal Marg. Sanganer Airport,
Jaipur- 302011
Tel. 0141-581431 32 33 34
E-mail: iihmr@iihmr.org

(د) مرکزی حکومت کے اہم ترین کمپیوٹر کورس: وزارت انفارمیشن ٹیکنالوجی حکومتِ ہند کے زیرِ اہتمام ڈپارٹمنٹ آف الیکٹرانکس ایکریڈیشن آف کمپیوٹر کورسس (DOEACC) ملک بھر

میں قائم ہے۔ اس کے 750 مراکز ملک گیر سطح پر کام کر رہے ہیں جن میں انٹر میڈیٹ یا پی یو سی (2+10) کے بعد داخلے جاری ہیں۔ اس میں چار سطح کے کورسس فراہم ہیں۔ لیول (Level) O,A,B,C, کہلاتے ہیں۔ B,Level کورس MCA کے مماثل ہے۔ ایک IT Professional بننے کے لیے طالب علم یہ کورسس کر لیتا ہے تو پھر کمپیوٹرس میں اس کے کیریئر کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ مزید اور مکمل تفصیلات اس پتے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

Doeacc Society
Electronics Niketan, 6,CGO Complex
New Delhi-110003
Tel.: 011 4363330/31132 Fax: 011-4363335
E-mail:doeacc@doe ernet.in
website: www doeacc org.in

IV روزگار:-

(الف) آٹھویں اور دسویں جماعت کامیاب طلبہ کے لیے سرکاری روزگار: بھارت سنچار نگم لمیٹڈ کے کوئمبٹور ٹیلی کمیونیکیشنز کی بابت سے "انٹرنیٹ ڈھابہ" قائم کرنے کے لیے آٹھویں جماعت اور دسویں جماعت کامیاب طلبہ سے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ دیہی مقامات سے تعلق رکھنے والے طلبہ صرف آٹھویں تک پڑھے ہوں تو کافی ہے۔ جنگوں کے شہید کی بیواؤں، معذورین اور سابق فوجیوں کے لیے کسی تعلیمی قابلیت کی کوئی شرط نہیں۔ کوئمبٹور کے کوئی 20 اہم مقامات پر ٹیلی فون بوتھ 25 فی صد کمیشن پر قائم کرنے کے لیے بے روزگاروں سے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ مقررہ درخواست فارم اس پتے سے حاصل اور داخل کیے جاسکتے ہیں۔

Customer Service Centre
Office of the principal General Manager.
BSNL,1237, Tricay Road- Coimbatore-18
Website: www.tamilnadu-telecom.com

(ب) Web Development کے مواقع: مرکزی حکومت کے Department of official Language میں انگریزی، ہندی، تلگو، تمل، ملیالم، کنڑ اور بنگلہ کے کوئی 3500 صفحات کی ویب ڈیولپمنٹ کے لیے شعبے نے اہل امیدواروں / ایجنسیوں سے Quotaions طلب کیے ہیں۔ ویب ڈیزائن کرنے والے فی صفحہ اپنی شرح بتاتے ہوئے درخواستیں فوراً اس پتے پر روانہ کر سکتے ہیں۔ مزید تفصیلات اس پتے پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

Director (Technical)
Department of official Language
2nd floor, Lok Nayak Bhavan Khan Market.
New Delhi-110003

V اہم اطلاع:-

(الف) پری میڈیکل، ڈینٹل امتحان: آل انڈیا پری میڈیکل، ڈینٹل انٹرنس ٹسٹ 13 رمئی 2001 کو ہوگا۔ CBSE اس کا انعقاد کرے گا۔ ملک بھر کے منتخب کینرا بینک سے درخواستیں حاصل کر سکتے ہیں۔ فارم کی قیمت 200 روپے مقرر ہے۔

(ب) عالمی سطح کا IIT، این آر آئیز کے لیے: حکومت ہند نے ایک ملین ڈالر کی لاگت سے NRI's کے لیے انھی کی جانب سے قائم کی جانے والے انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کی تجویز اور منصوبے کو منظوری دے دی ہے۔ اس سلسلے میں تشکیل دی گئی کمیٹی کے صدر مسٹر اے پی جے عبدالکلام سائنسی مشیر برائے وزیر اعظم ہند نے اس کا اعلان کیا ہے۔ اس کمیٹی میں 35 اعلا سطح کے اراکین شامل تھے۔ یہ ادارہ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور دیگر ٹیکنالوجی شعبوں کا ایک عالمی سطح کا ادارہ ہوگا۔

(ج) منی پال گروپ کا IIIT، بنگلور میں: منی پال گروپ آف ایجوکیشن کی جانب سے بنگلور میں ایک اہم انفارمیشن ٹیکنالوجی ادارہ (MIIT) سنٹرل پارک ہوٹل میں قائم کیا گیا ہے جو عنقریب 20 ایکڑ اراضی پر مشتمل کیمپس میں منتقل کر دیا جائے گا۔ C-PAL کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر این چندرا شیکھرن اس کے پروائس چانسلر بنائے گئے ہیں۔ جو فی الحال حکومت کرناٹک کے انفارمیشن ٹیکنالوجی ٹاسک فورس (ایجوکیشن) کے صدر نشین ہیں۔

(د) کو نکنی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت: گوا یونیورسٹی نے 4000 صفحات پر مشتمل کو نکنی انسائیکلوپیڈیا شائع کر دی ہے۔ جس میں کو نکنی مادری زبان رکھنے والوں کے لیے دنیا بھر کے علوم کی معلومات پر مبنی 5000 اندراجات اور 800 تشریحات شامل ہیں۔

161, Nehru Nagar
Kachiguda, Hyderabad-27

امریکی ادب کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر سلامت اللہ خاں

انیسویں صدی سے امریکہ میں ایسا ادب تخلیق ہو رہا ہے جو اپنی بعض خصوصیات میں دوسرے ممالک کے انگریزی ادب سے مختلف ہے۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ امریکی ادب کے تاریخی اور ثقافتی سیاق و سباق کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔

دوسرا ایڈیشن

192 صفحات — قیمت: 52 روپے

سیدہ سارہ اظہر شطاری

کمپیوٹر گپ بازی

اسکول کے زمانے سے ہی ہم سب گپ بازی (Chit Chat) کرتے آئے ہیں اور اس کی وجہ سے ہم سب کو اپنے ٹیچرس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کئی بار سننی پڑتی تھی۔ بعض وقت تو وہ غصے سے کہتے تھے Stop- Chatting اسی گپ بازی کی وجہ سے ہم کو تو اسکول میں Chatter-Box کا نام بھی دیا گیا تھا۔ لیکن کیا پتا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہی گپ بازی (Chatting) ایک روز ایک فیشن کے طور پر ابھر کر آئے گی۔ کمپیوٹر ایک معمولی سی مشین سے لے کر ایک On Line مشین بن گیا ہے۔ جب اسے Modem کے ذریعے ٹیلی فون سے جوڑ دیا جاتا ہے تو یہ تمام دنیا کو ایک دوسرے سے بہت ہی قریب کر دیتا ہے اور اسی وجہ سے آج کل لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہونے کے باوجود آپس میں گپ بازی (Chatting) کرنے لگے ہیں۔ انٹرنیٹ کی سب سے اہم سہولتیں تین حصوں میں بانٹ دی گئی ہیں۔ 1۔ براؤزنگ ویب (Browsing Web)۔ 2۔ ای میل (E-mail) 3۔ گپ بازی (Chatting)۔

1۔ براؤزنگ ویب کے معنی ایک جال کے سے ہیں جو ساری دنیا کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ اس ایک ویب میں کئی ہزار ویب سائیٹس موجود رہتے ہیں جن کے تحت سائنس، ٹیکنالوجی، سیاست، اسپورٹس، تعلیمی معلومات اور بہت ساری دوسری معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ان ویب سائیٹس کو پڑھنا اور ان کے ذریعے معلومات حاصل کرنا براؤزنگ کہلاتا ہے۔ براؤزنگ ایک لائبریری کی طرح ہے جہاں پر ہم اپنی پسند کی کتاب حاصل کر سکتے ہیں اور اسی سے اپنی دلچسپی کی خاص خاص باتیں اپنی کاپی میں اتار لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ویب سائیٹ سے کوئی معلومات اپنی فلاپی (Floppy) میں اتار لیتے ہیں یا نقل کر لیتے ہیں جسے انٹرنیٹ کی زبان میں Down- Loading- Information کہتے ہیں۔ کچھ اہم اور سب سے زیادہ مشہور اور فائدہ مند ویب سائیٹس کے نام یہ ہیں۔

www. Gobap.com, www. Education online com
www.shahien.com, www.Javatutor.com

انٹرنیٹ کی دوسری اور سب سے زیادہ استعمال میں آنے والی سہولت کا نام ہے ای میل (E-mail) الکٹرانک میل جس کے ذریعے آپ اپنا کوئی پیغام صرف پانچ سیکنڈ کے اندر اپنے کسی بھی قریبی رشتہ دار، عزیز یا دوست کو، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، پہنچا سکتے ہیں۔ ای میل (E-mail) آج کے دور کا سب سے سستا اور سب سے تیز رفتار والا پوسٹ مین (Post-man) مانا جاتا ہے۔ ٹیلی فون جیسی مہنگی چیز کا استعمال ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور برخلاف اس کے وہی چیز ہم ای۔ میل (E-mail) کے ذریعے بہت ہی کم پیسوں میں کر سکتے ہیں۔ ای میل (E-mail) کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا اپنا ای میل کھاتہ ہو اور یہ کھاتا (Account) کھولنے کے لیے کسی ڈپازٹ کی ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ کئی ویب سائیٹس یہ سہولت مفت فراہم کرتے ہیں۔ سب سے پہلا ویب سائیٹ (Web-Site) یاہو میل (Yahoo-mail) تھا۔ اس کے بعد ہاٹ میل (Hot- mail) ایم۔ ایس۔ این میل نئی (MSN-mail City)، کول میل (Cool mail)، ریڈیف میل (Rediff-mail) وغیرہ وغیرہ جیسے کئی ای۔ میل منظر عام پر آئے۔ آج کل Rediff-mail سب سے تیز رفتار ای میل۔ مانا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے صرف پانچ سیکنڈ کے اندر آپ کا میل یہاں سے دوسری جگہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ای۔ میل کی کئی اور سہولتیں Rediff mail کے ذریعے ہم کو مل سکتی ہیں۔ اس کے ذریعے تصویر کو انٹرنیٹ پر ڈالا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کچھ اہم موقعوں پر مبارکبادی پیغام (Greetings) وغیرہ بھی روانہ کیے جاسکتے ہیں۔ تیسری اور سب سے زیادہ آج کل انٹرنیٹ پر پسندیدہ سہولت گپ بازی (Chatting) ہے Chatting اپنے بے کار وقت میں کسی اور کے ساتھ گپ شپ کرنے کو کہتے ہیں۔ Chatting میں ہوتا یوں ہے کہ آپ کسی اجنبی سے کمپیوٹر کے ذریعے بات چیت کر سکتے ہیں۔ اس Chatting میں آپ کی ملاقات کبھی کبھی اتفاقاً کچھ بڑی بڑی اور مشہور ہستیوں سے بھی ہو جاتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر Chatting کے دوران کسی نے رتک روشن (Rithik-Roshan) سے بات چیت کی یا پھر کسی نے ایشوریا رائے سے گپ بازی کی۔

ٹی وی اسکرین کے مشہور اداکار شیکھر سمن تو اکثر گپ بازی کے لیے رات بارہ بجے کے بعد ملتے ہیں۔ Chatting یاہو (Yaoo) اور Rediff کے ذریعے کی جاتی ہے جہاں پر آپ کو اپنے

نام کے ساتھ Log-In کرنا پڑتا ہے اور آپ کس قسم کی گپ بازی کرنا چاہتے ہیں اس Option- Button کو دبانا ضروری ہے۔ گپ بازی کے لیے کچھ اہم Options یہ ہیں جیسے (Friend Ship)، Film Stars، Cricketers، Educationist، Politicians اور Fun پروگرام۔ جب ہم ان میں سے کسی ایک کو چن لیتے ہیں تو کمپیوٹر پوری دنیا میں اس Option میں موجود اس وقت سسٹم پر بیٹھے ہوئے اور اس کو استعمال کرنے والے لوگوں کی ایک مکمل فہرست آپ کے سسٹم پر ڈال دیتا ہے۔ اب اس میں سے آپ اپنی پسند سے جس کسی سے بھی بات چیت یا گپ بازی کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

آج کل کمپیوٹر کے ذریعے گپ بازی کا شوق نوجوان نسل میں بہت عام ہوتا جارہا ہے۔ کئی نئے دوست اسی کمپیوٹر کے ذریعے بنائے جارہے ہیں اور پھر یہ دوستی آگے چل کر ایک عادت سی بن جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر انٹرنیٹ سنٹر کسی بھی وقت چاہے دن ہو کہ رات نوجوانوں سے بھرا نظر آرہا ہے۔ اس دوستی کو Virtual- Friend ship کا نام دیا جارہا ہے اور اس بن دیکھے دوست کی وجہ سے اپنے بچپن کے قریبی دوستوں اور اپنے پاس پڑوس کے رہنے والوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی تمام کمزوریوں اور برائیوں کو اس کمپیوٹر دوستی کے ذریعے چھپا دیتا ہے اور اپنے آپ کو Virtual Friend Ship کے بہانے ایک بہت ہی اچھے انداز میں اپنے بن دیکھے دوست کے سامنے پیش کرتا ہے۔ کچھ نوجوان اپنی کمزوریوں اور برائیوں کی وجہ سے اچھے دوست نہیں بنا پاتے۔ تو ایسے لوگ Virtual Friend Ship کے ذریعے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کئی بار ایسا دیکھا گیا ہے کہ یہ بنا دیکھے دوستی بہت ہی بھیانک روپ اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے اپنا وقت کمپیوٹر گپ بازی میں ضائع نہ کریں اور انٹرنیٹ پر براؤزنگ کے ذریعے اچھی سی معلومات سائیٹ (Site) پر جاکر کچھ مفید باتیں معلوم کرنے کی کوشش کریں نہ کہ ایسی لغو اور واہیات قسم کی گپ بازی میں اپنا وقت بے کار اور تباہ کریں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل ہر گلف، ہر گلی، ہر چوراہے پر اور خاص طور پر ہر بیکری (Bakery) کے ساتھ ایک انٹرنیٹ سنٹر لگا ہوا ہے۔ کہیں اسے انٹرنیٹ کیفے کا نام دیا گیا ہے تو کسی نے اسے سائبر کیفے کا نام دیا ہے تو کوئی سائبر پوائنٹ (Siber Point) ہے اور یہ تمام کے تمام سنٹر کالج کے طلبا اور طالبات سے بھرے نظر آئیں گے۔ ان تمام سنٹرس کو اس خوبصورتی سے سجایا جاتا ہے کہ اگر ایک بار آپ وہاں داخل ہو جائیں تو پھر باہر نکل آنے کو آپ کا دل نہیں چاہے گا۔

یہاں پر اندر داخل ہوتے ہی ایر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آپ کا سب سے پہلے استقبال کرے گی۔ خوبصورت قالین ہر طرف چھوٹے چھوٹے کیبن اور ان میں گھومنے والی آرام دہ کرسیاں ساتھ میں وہیں پر آپ کو کھانے کے لیے کیک۔ پیسٹری اور کولڈ رنک کا اہتمام اور فضا میں ہلکی ہلکی موسیقی اس دلکش ماحول سے آپ کو باہر نکلنے نہیں دیتی اور آپ گھنٹوں اپنا وقت کمپیوٹر پر گپ بازی میں برباد کر دیتے ہیں۔

بہت سے نوجوان گھر سے کمپیوٹر سنٹر جارہے ہیں کہہ کر ماں باپ سے پیسہ لے کر یہاں پر اس قسم کی بیہودہ گپ بازی میں اپنے ماں باپ کا پیسہ اور اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں اور اس طرح کمپیوٹر کا آج کل بے جا استعمال کیا جارہا ہے۔ بڑے شہروں میں تو آج کل کمپیوٹر پر گپ بازی ایک فیشن بن گیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خطرناک فیشن سے اپنے آپ کو دور رکھیں اور کمپیوٹر کا اچھی معلوماتی چیزوں کے لیے ہی استعمال کریں۔

Right Thing For Right Purpose

(بہ شکریہ "سیاست" حیدر آباد، 27/اگست 2000ء)

بچوں کے لیے

بھارت کی لوک کتھائیں

تین جلدوں میں

باز گو: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

قیمت فی جلد : 12/روپے

رابن ہڈ کے کارنامے

ترجمہ و تلخیص : ایم ندیم

قیمت : 15/روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

فیروز عالم

اردو ادب کوئز II

(1) اردو شاعری کا عہدِ زریں کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) میر و سودا کا عہد (ب) غالب و مومن کا عہد
(ج) ناسخ و آتش کا عہد (د) ترقی پسند عہد

(2) شہنشاہِ تغزل کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) میر (ب) سودا
(ج) غالب (د) فراق

(3) قصیدہ گوئی میں کس شاعر کو اولیت حاصل ہے؟
(الف) میر (ب) سودا
(ج) ذوق (د) غالب

(4) اردو شاعری میں کس کو سب سے بڑا صوفی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے؟
(الف) ولی (ب) امیر خسرو
(ج) درد (د) اصغر گونڈوی

(5) مثنوی 'خواب و خیال' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) میر حسن (ب) میر اثر
(ج) میر ضاحک (د) نسیم

(6) نادر شاہی حملے کے بعد بہت سے دہلوی شاعروں نے لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا لیکن ایک اہم شاعر دہلی میں ہی رہے۔ ان کا نام کیا ہے؟
(الف) میر (ب) سودا
(ج) درد (د) میر سوز

(7) ہجویات میں کس شاعر کو کمال حاصل ہے؟
(الف) ذوق (ب) سودا
(ج) ضاحک (د) میر

(8) میر کا پورا نام کیا ہے؟
(الف) محمد تقی (ب) محمد متقی
(ج) تقی احمد (د) مرزا تقی

(9) 'نکات الشعرا' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) مرزا مظہر جانِ جاناں (ب) میر
(ج) ناسخ (د) محمد حسین آزاد

(10) سودا کا پورا نام کیا ہے؟
(الف) مرزا محمد رفیع (ب) محمد رفیع الدین
(ج) رفیع احمد (د) رفیع حسین

(11) 'سید حارستہ' (1670ء) کس کی تصنیف ہے؟
(الف) فضلی (ب) غلام علی
(ج) جوش عظیم آبادی (د) شاہ عماد

(12) میر عطا حسین تحسین نے فارسی قصّے چہار درویش کا اردو ترجمہ کس نام سے کیا؟
(الف) باغ و بہار (ب) آرائشِ محفل
(ج) نوطرزِ مرصع (د) فسانۂ عجائب

(13) 'ہندستانی گرامر' نام کی کتاب کس نے لکھی؟
(الف) جان گلکرسٹ (ب) نیلر
(ج) فاربس (د) فیلن

(14) کس داستان کو اردو نثر کی تاریخ میں سنگِ میل کا مقام حاصل ہے؟
(الف) سب رس (ب) نوطرزِ مرصع
(ج) باغ و بہار (د) فسانۂ عجائب

(15) 'باغ و بہار' اور 'گنجِ خوبی' کس کی تصانیف ہیں؟
(الف) میر امن (ب) نہال چند لاہوری
(ج) رجب علی بیگ سرور (د) عطا حسین تحسین

(16) 'آرائشِ محفل' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) للو لال جی (ب) میر امن
(ج) حیدر بخش حیدری (د) سرور

(17) منشی سجان رائے کی فارسی کتاب "تاریخ خلاصۃ التواریخ" کا اردو ترجمہ میر شیر علی افسوس نے کس نام سے کیا؟
(الف) باغِ اردو (ب) گلشنِ ہند
(ج) آرائشِ محفل (د) گلِ مغفرت

(18) 'نثرِ بے نظیر' کے نام سے کس نے 'سحر البیان' کو نثر میں پیش کیا؟
(الف) میر بہادر علی حسینی (ب) مرزا علی لطف
(ج) افسوس (د) للو لال جی

(19) مرزا کاظم علی جوان نے کالی داس کی لازوال تخلیق ابھگیان شاکنتلم کا ترجمہ اردو میں کس عنوان سے کیا؟
(الف) کام کندلا (ب) مادھو نل
(ج) بکٹ کہانی (د) شکنتلا ناٹک

(20) فورٹ ولیم کالج میں فارسی اور سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ اس کا مقصد تھا
(الف) انگریز نووارد وں کو اردو زبان سکھانا
(ب) اردو زبان و ادب کی ترقی
(ج) ادب سے لگاؤ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(21) انشاءاللہ خاں انشاء کی کس کتاب میں فارسی اور عربی الفاظ سے گریز کرتے ہوئے ہندستانی کو اوّلیت دی گئی ہے؟
(الف) نورتن (ب) بکٹ کہانی
(ج) رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی
(د) ان میں سے کوئی نہیں

(22) 'دریائے لطافت' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) مولوی عبدالحق (ب) انشاءاللہ خاں انشا
(ج) رجب علی بیگ سرور (د) رشید حسن خاں

(23) 'فسانہ عجائب' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) میر امن (ب) تحسین
(ج) رجب علی بیگ سرور (د) حیدر بخش حیدری

(24) انشا کی کس کتاب میں ایک بھی 'نقطہ' نہیں ہے؟
(الف) رانی کیتکی کی کہانی (ب) سلک گہر
(ج) دریائے لطافت (د) ان میں سے کوئی نہیں

(25) 'ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی' نے ریاضی، سائنس، نجوم، منطق اور فلسفے کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور اردو زبان کے دامن کو وسیع کیا۔ اس کا تعلق کس ادارے سے تھا۔
(الف) ایم۔اے۔او کالج (ب) دلی کالج
(ج) فورٹ ولیم کالج (د) ان میں سے کوئی نہیں

(26) سائنسی خیالات کی ترویج کے لیے ماسٹر رام چندر نے کون سے رسائل شائع کیے؟
(الف) 'فوائد الناظرین' اور 'محب ہند'
(ب) 'تہذیب الاخلاق' اور 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'
(ج) 'صدائے عام' اور 'کامریڈ'
(د) ان میں سے کوئی نہیں۔

(27) 'عجائب روزگار' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) ماسٹر رام چندر (ب) رتن ناتھ سرشار
(ج) سرسید (د) حالی

(28) دبستانِ لکھنؤ کس خصوصیت کے لیے جانا جاتا ہے؟
(الف) داخلیت (ب) خارجیت
(ج) تصوف (د) فلسفہ

(29) میر حسن کا پورا نام کیا ہے؟
(الف) میر غلام حسین حسن (ب) میر ببر علی
(ج) میر علی حسن (د) ان میں سے کوئی نہیں

(30) 'سحر البیان' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) میر (ب) میر حسن
(ج) دیا شنکر نسیم (د) مصحفی

(31) جرأت کا نام درج ذیل میں سے کیا ہے؟
(الف) فقیر محمد خاں (ب) محمد تقی
(ج) محمد رفیع (د) شیخ قلندر بخش

(32) ریختی کا شاعر کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) سعادت یار خاں رنگین (ب) قلندر بخش جرأت
(ج) مصحفی (د) انشاءاللہ خاں انشا

(33) شیخ غلام ہمدانی کا تخلص کیا ہے؟
(الف) ناسخ (ب) آتش
(ج) مصحفی (د) رند

(34) کس شاعر کو 'اولڈ ڈکٹیٹر' کہا جاتا ہے؟
(الف) غالب (ب) ناسخ
(ج) میر (د) داغ

(35) آتش کا پورا نام کیا ہے؟
(الف) امام بخش (ب) خواجہ حیدر علی
(ب) میر غلام حسن (د) ان میں سے کوئی نہیں

(36) 'گلزار نسیم' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) میر حسن (ب) دیا شنکر کول نسیم
(ج) میر (د) غالب

(37) میر انیس کو کس صنفِ شاعری میں کمال حاصل ہے؟
(الف) مرثیہ (ب) مثنوی
(ج) غزل (د) قصیدہ

(38) دبیر کا پورا نام کیا ہے؟

(الف) میر ببر علی (ب) مرزا سلامت علی
(ج) ضاحک علی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(39) 'گریز' کا تعلق کس صنفِ شاعری سے ہے؟
(الف) قصیدہ (ب) مرثیہ
(ج) مثنوی (د) غزل

(40) 'بین' کس صنف کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے؟
(الف) قصیدہ (ب) مرثیہ
(ج) واسوخت (د) نظم

(41) "اردو کے آسمانِ شاعری پر نظیر تنہا درخشاں ستارا ہے" یہ کس نے کہا ہے؟
(الف) حالی (ب) شبلی
(ج) کلیم الدین احمد (د) احتشام حسین

(42) 'آدمی نامہ' کس کی نظم ہے؟
(الف) نظیر اکبر آبادی (ب) حالی
(ج) اقبال (د) چکبست

(43) خالص غزل کا شاعر کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) مومن خاں مومن (ب) غالب
(ج) حسرت (د) فراق

(44) بہادر شاہ ظفر نے 'خاقانیِ ہند' کا خطاب کسے دیا تھا؟
(الف) غالب (ب) مومن
(ج) ذوق (د) شاہ نصیر

(45) 'مرزا نوشہ' کے نام سے کس شاعر کو شہرت حاصل تھی؟
(الف) ذوق (ب) میر
(ج) غالب (د) مومن

(46) "میں نے وہ طرز ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا"۔ یہ کس نے کہا ہے؟
(الف) غالب (ب) ابوالکلام آزاد
(ج) رشید احمد صدیقی (د) حسرت

(47) غالب کو مغل دربار سے کیا خطاب ملا تھا؟
(الف) خاقانیِ ہند (ب) طوطیِ ہند
(ج) رستمِ ہند (د) نجم الدولہ دبیر الملک

(48) درج ذیل میں سے غالب کی تخلیق کون سی ہے؟
(الف) مہر نیمروز (ب) دستنبو
(ج) اردوئے معلی (د) تینوں

(49) بہادر شاہ ظفر نے شاہ نصیر اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کے بعد کسے اپنا استاد بنایا۔
(الف) غالب (ب) مومن
(ج) داغ (د) ناسخ

(50) مندرجہ ذیل شعر میں کس صنف کا استعمال ہوا ہے؟
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
(الف) حسنِ تعلیل (ب) تجاہلِ عارفانہ
(ج) تضاد (د) ایہام

(51) مافوق الفطری عناصر کس صنفِ شاعری میں پائے جاتے ہیں؟
(الف) مثنوی (ب) مرثیہ
(ج) غزل (د) واسوخت

(52) درج ذیل میں اردو کا سب سے پہلا اخبار کون سا ہے؟
(الف) دہلی اردو اخبار (ب) جام جہاں نما
(ج) آگرہ اخبار (د) ان میں سے کوئی نہیں

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

264, Sabarmeti Hostel
JNU, New Delhi-67

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

پروفیسر محمد حسن

ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

پہلی اشاعت

334 صفحات قیمت: 98 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: پروفیسر محمد حسن

1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تخیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

پہلی اشاعت

600 صفحات قیمت: 156 روپے

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

اکتوبر تا دسمبر 2000ء

انفارمیشن ٹیکنالوجی کی افادیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اردو بولنے والے طلبہ کو نئے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جو عملی پیش رفت کی تھی اس کے تحت ملک بھر میں 75 کمپیوٹر تربیتی مراکز کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ ہندستان کی 20 ریاستوں کے 59 ضلعوں میں پھیلے ہوئے ان کمپیوٹر مراکز میں ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ مائی کروسافٹ ڈی ٹی پی میں 4740 طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اس اسکیم کا مقصد اردو والوں کے اس طبقے تک اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی رسائی اور روزگار کے باوقار مواقع کی فراہمی ہے جس کے پاس سہولتیں کم ہیں اور ترقی کے راستے کم و بیش مسدود ہیں۔

قومی اردو کونسل نے حال ہی میں الہ آباد کے مدرسہ جامعۃ الحسن میں بھی کمپیوٹر تربیتی مرکز قائم کیا ہے جس کا افتتاح ترقی انسانی وسائل کے مرکزی وزیر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے 31/دسمبر کو کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جوشی نے کہا کہ مسلم سماج کے اکثر بچے مدرسوں تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کی اس اسکیم کی مدد سے وہ بھی نئی زندگی کی سوغاتوں سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔ مدرسوں میں پڑھنے والے ان بچوں کو بھی عصری زندگی کے علوم حاصل کرنے اور بہتر معیار زندگی حاصل کرنے کا حق ہے۔ اس کے لیے مدرسوں کی تعلیمی معاونت اور ان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تعلیم کی فراہمی ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں قومی اردو کونسل سے توقع کرتا ہوں کہ وہ اس طرف بھی پیش رفت کرے گی اور اس اسکیم کا پھیلاؤ مدرسوں تک ہو جائے گا۔

مدرسہ جامعۃ الحسن کے مہتمم قاری محمد احمد صاحب نے کمپیوٹر تعلیم کی اس اسکیم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس اسکیم کی وجہ سے اردو دنیا میں ایک انقلاب آگیا ہے اور ہر طرف نئی تعلیم کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اسکیم کا تفصیلی تعارف کرایا اور اردو بولنے والوں کی نئی تعلیم تک رسائی ہو، اس کے لیے کونسل کی کاوشوں پر روشنی ڈالی۔

الہ آباد میں قدوائی قادر میموریل گرلز انٹر کالج میں واقع قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر مرکز سے فارغ طلبہ کے لیے تقسیم اسناد کا جلسہ 31/دسمبر 2000ء کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل اور چیرمین قومی اردو کونسل نے اسناد تقسیم کیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جوشی نے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پورے بھارتیہ سماج کو، خصوصاً مسلمانوں کو معاصر تعلیم حاصل کر کے آگے آنا ہوگا تبھی ہندستان کی حقیقی ترقی ممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس اسکیم کی توسیع اردو پڑھنے والے اس طبقے تک ہو جس کی رسائی رسمی تعلیم تک نہیں ہے، یہی میری تمنا ہے۔

اس موقعے پر قدوائی میموریل ٹرسٹ کے چیرپرسن پروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ گذشتہ پچاس برسوں میں فروغ اردو کے لیے اس طرح سے منظم پالیسی سازی نہیں کی گئی تھی، جیسی اب گذشتہ دو تین برسوں میں قومی اردو کونسل کے ذریعے کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے بعد ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی پہلے وزیر تعلیم ہیں جو بنیادی پالیسی سازی اور فکر کی نئی جہتوں کی بات کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی کچھ باتوں سے اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن گذشتہ تین برسوں میں جس تیزی سے اردو کی ترویج کا منظر نامہ اور اردو تعلیم کا ایجنڈا بدلا ہے اس سے اردو عوام کے لیے ڈاکٹر جوشی کا کمٹ منٹ ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اپنی تقریر میں اردو سماج کی عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے قومی اردو کونسل کی اسکیموں کا تعارف کمپیوٹر وزول (Visiual) کے ذریعے کرایا۔

مراسلاتی کورس کا آغاز

اردو کا رسم خط سکھانے کے لیے یوں تو کئی کتابیں موجود ہیں لیکن ایسے طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر جن کے لیے باقاعدہ کلاس روم میں جاکر اردو پڑھنا ممکن نہیں ہے، ایسے مراسلاتی کورس کی اشد ضرورت ہے جو جدید ترین معیاروں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا

ہو تاکہ اردو ادب کا سرمایہ اپنے ہی رسم خط میں وسیع تر حلقوں تک پہنچ سکے۔ اسی لیے قومی اردو کونسل نے ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو سکھانے کا کورس نئے سال کے ساتھ جنوری سے شروع کر دیا ہے۔ اس کورس کا مقصد ایسے لوگوں کو اردو رسم خط سکھانا ہے جو اردو ہندی زبانیں بولنا جانتے ہیں۔ گذشتہ ماہ دا خلے کا اشتہار پڑھ کر اردو سیکھنے کے شائقین نے بے حد جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے۔ ڈاک اور ای میل کے ذریعے ہزارہا خطوط ایسے لوگوں کے موصول ہو رہے ہیں جو اردو رسم خط سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں تقریباً 95 فیصد خط غیر مسلم حضرات کے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر رسم خط سیکھنے کے مناسب مواقع مہیا ہوں تو ہر مذہب اور طبقے کے لوگ اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ اردو کو غیر ملکی تشخص کی حامل اور علاحدگی پسندی کے رجحان کی پروردہ زبان کہنے والوں کے لیے اردو شائقین کا یہ ردِ عمل کرارا جواب ہے جو ایک بار پھر اس حقیقت کی توثیق کرتا ہے کہ اردو بھی اتنی ہی ہندستانی الاصل ہے جتنی کوئی دیگر ہندستانی زبان ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اردو سیکھنے کے خواہش مند ہیں اور اس کے توسل سے اردو کلچر کے قریب آنا چاہتے ہیں ان کا اپنا ایک تشخص ہے، ان کی اپنی زبانیں ہیں، ان لوگوں میں سائنس کے طالب علم بھی شامل ہیں، دوسرے مضامین کے پی ایچ ڈی اسکالرز بھی، پروفیشنلز بھی اور بچے بھی۔ ای میل کے موصول ہونے والے استفسارات کی اکثریت ظاہر کرتی ہے کہ یہ کورس اقتصادی طور پر آسودہ حال ان لوگوں کو اپنی طرف راغب کر رہا ہے جو تعلیم کی جدید تر اور بیشتر صورتوں میں بین الاقوامی سطح کی سہولتوں سے فیض یاب ہیں۔ اردو کی طرف ان لوگوں کی رغبت انفارمیشن ٹیکنالوجی سے اردو کے پوری طرح ہم آہنگ ہونے کا ثبوت ہے اور بلا شبہ اس میں قومی اردو کونسل کی کوششوں کا بھی حصہ ہے۔

کل ہند اردو کتاب میلہ

کتابیں قوموں کا حافظہ ہیں۔ اگر ہمیں اپنی تہذیبی اور تاریخی یادداشتیں عزیز ہیں تو کتابوں سے ہمارا رشتہ مستحکم رہنا چاہیے۔ قومی اردو کونسل اردو کتابوں کی اشاعت و ترویج کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہے۔

4 تا 12 / نومبر 2000ء کے دوران قومی اردو کونسل نے نیشنل بک ٹرسٹ کے اشتراک سے لال قلعے کے میدان میں پہلے کل ہند کتاب میلے کا انعقاد کیا۔ میلے کا افتتاح محترمہ شیلا دکشت، وزیر اعلا دہلی سرکار نے کیا تھا اور جناب سید شاہنواز حسین، مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل بہ طور مہمان خصوصی تشریف لائے۔ 9 روزہ اس میلے میں دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں نے رنگارنگ ثقافتی پروگراموں کے مقابلے پیش کیے اور دہلی اردو اکادمی کی جانب سے شعری نشست، شام غزل، قوالی وغیرہ کا اہتمام کیا گیا۔ کتاب میلے میں ایک ہزار ٹائٹلوں پر مشتمل کتب فروخت ہوئیں جن کی مجموعی قیمت کا اندازہ 20 لاکھ روپے ہے۔ میلے میں 68 ناشرین و تاجران کتب نے اپنے اسٹال لگائے تھے جن میں ریاستی اردو اکادمیاں اور بیرون دہلی کے دیگر کئی ناشرین شامل تھے۔ میلے میں جن ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی اور میلے کے عین بیچ بنائے گئے خوبصورت پنڈال میں موجود سینکڑوں اردو دوستوں سے خطاب کیا ان میں مرکزی وزیر مملکت جناب سید شاہنواز حسین، دہلی کی وزیر اعلا محترمہ شیلا دکشت اور کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علاوہ حضرات خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، جناب م۔ افضل، سابق ایم پی، شاہد صدیقی، ایڈیٹر نئی دنیا، عزیز برنی، جوائنٹ ایڈیٹر راشٹریہ سہارا، پروفیسر اختر الواسع، صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، سید انور سعید، رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ، بشیر احمد، وزیر جنگلات جموں وکشمیر، جناب خورشید عالم خاں، سابق گورنر اور جناب قیصر شمیم، سکریٹری سینٹرل وقف کونسل کے نام شامل ہیں۔ آج کے دور میں الیکٹرونک میڈیا زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے جس سے کتب بینی کے ذوق میں کمی آئی ہے اور پبلشنگ انڈسٹری کئی برسوں سے اپنے وجود کے لیے خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ ایسے حالات میں اردو کتاب میلے کا انعقاد اردو پڑھنے اور بولنے والے لوگوں کے درمیان کتب بینی کے فروغ کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہو، اس اعتبار سے یہ کتاب میلہ تاریخی نوعیت کا حامل ہو گیا۔

اردو اکادمیوں کی تیسری کل ہند کانفرنس

اردو کے ملک گیر پھیلاؤ کے سبب یہ ضروری ہے کہ ریاستی اردو اکادمیوں اور مرکزی نوڈل ادارے قومی اردو کونسل کے مابین رشتے مستحکم ہوں تاکہ مشترکہ لائحۂ عمل کے تحت مختلف پروجیکٹوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ اس باہمی کوآرڈی نیشن کے لیے قومی اردو کونسل ریاستی اردو اکادمیوں کے مشترکہ اجلاس کا اہتمام کرتی ہے جس کے سبب نہ صرف یہ کہ اکادمیاں ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے باخبر رہتی ہیں بلکہ اس نظم و ضبط کی وجہ سے ایسے اقدام کی تکرار کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے کاموں سے لاعلمی کے سبب عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی موضوع پر دو مختلف اکادمیوں میں پروجیکٹ کی منظوری، کتب کی اشاعت وغیرہ۔

اس سلسلے میں کونسل نے ریاستی اردو اکادمیوں کی تیسری سہ روزہ کانفرنس 14 تا 16 / اکتوبر 2000ء کو راجستھان اردو اکادمی

کے زیرِ اہتمام جے پور میں منعقد کی جس میں 14 اردو اکادمیوں کے 50 مندوب اور کئی وزرا شریک ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح راجستھان کے وزیرِ تعلیم جناب سی پی جوشی نے کیا اور افتتاحی جلسے میں اتر پردیش، بہار اور مہاراشٹر کے وزرائے محترم شیما رضوی صاحبہ، شکیل احمد خاں صاحب اور این۔ پی۔ ہیرین صاحب نے بھی سامعین سے خطاب کیا۔ اکادمیوں کی اس کامیاب سہ روزہ کانفرنس کی روداد اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔ کانفرنس میں منظور ہونے والی تجاویز ریکارڈ کی غرض سے شائع کی جا رہی ہیں:

1۔ یہ اجلاس تامل ناڈو اردو اکادمی کی تشکیل کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے سفارش کرتا ہے کہ جن ریاستوں میں اب تک اردو اکادمیوں کی تشکیل نہیں ہوئی ہے وہاں یہ ادارے بنائے جائیں۔ خاص طور سے نو تشکیل شدہ ریاستوں جھارکھنڈ، اترانچل اور چھتیس گڑھ میں اردو اکادمیوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

2۔ اس اجلاس کے مندوبین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ریاستی اردو اکادمیوں کی طرف سے اردو کی ترقی کے لیے کیے جا رہے اقدامات پر اظہارِ اطمینان کرتے ہوئے ریاستی اردو اکادمیوں کے ساتھ مضبوط روابط پر بھی طمانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ریاستی اردو اکادمیوں کو درپیش مالی مشکلات پر اظہارِ تشویش کرتے ہوئے ریاستی حکومتوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ اردو اکادمیوں کے لیے مختص رقوم بروقت جاری کریں اور اکادمیوں کی گرانٹ میں حسبِ ضرورت اضافہ بھی کریں تاکہ وہ اپنے منصوبوں پر بہ سہولت عمل پیرا ہو سکیں۔

3۔ یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ اردو تعلیم اور مشترکہ تہذیب کے فروغ کے لیے قومی اور بین اقوامی سطح کے جو پروگرام مرتب کیے جائیں، مرکزی حکومت ان کے لیے کُل یا کم از کم 50 فی صد گرانٹ جاری کرے۔

4۔ یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ ریاستی حکومتیں مطلوبہ تعداد میں اردو ذریعۂ تعلیم کے ابتدائی اور ثانوی اسکول قائم کریں۔ نیز موجودہ اردو میڈیم اسکولوں کو ترقی دے کر ان کا معیارِ تعلیم بڑھایا جائے تاکہ وہ قومی معیار اور قومی نصاب سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ اردو بولنے والی آبادی میں ناخواندگی دور کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں اور اردو اکادمیوں کو قومی لٹریسی مشن کا حصہ بنایا جائے تاکہ وہ خواندگی کے پروگرام میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

5۔ چوں کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کا فروغ حکومتِ ہند کا ایک اہم مقصد ہے اس لیے اس ٹکنالوجیکل مشن میں اردو اکادمیوں کو بھی شامل کیا جائے تاکہ اردو بولنے والے لوگ بھی ہندستان کی تکنیکی ورک فورس کا حصہ بن سکیں۔

6۔ یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ 2001ء کی مردم شماری اس طرح سے کروائی جائے کہ اردو داں آبادی کے حقیقی اعداد و شمار اور تعلیمی صورتِ حال سامنے آ سکے۔

7۔ اردو کی ترقی کے پروگراموں کو اس طرح سے مرتب کرنے کی سفارش کی جاتی ہے کہ علاقائی سطح پر علاقائی زبانوں کے ساتھ اس کے روابط مستحکم ہو سکیں اور قومی سطح پر قومی زبان کے ساتھ روابط استوار ہو سکیں۔

8۔ اردو زبان کے ارتقائی مراحل کی بازیافت ہندستانی تہذیبی پس منظر میں کرنے کی ضرورت ہے اور تاریخِ اردو زبان میں ان ہندستانی عناصر کو جگہ دینی ہوگی جنھوں نے اس زبان کے ارتقا میں بنیادی رول ادا کیا ہے، اس لیے قومی اردو کونسل ایک Research Repository قائم کرے اور اس کے لیے سبھی اکادمیاں اپنا تعاون دیں۔

پریم چند پر دو روزہ قومی سمینار

پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بہ طور افسانہ نگار اولیت کا شرف رکھتے ہیں اور ان کی تحریروں نے ان دونوں زبانوں کے باہمی رشتوں کو مزید نمایاں کیا ہے۔

پریم چند کی 64ویں برسی پر قومی اردو کونسل نے 8 اور 9 / اکتوبر کو دو روزہ قومی سمینار کا اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں کیا جس کا افتتاح مشہور فلم ہدایت کار و نغمہ نگار جناب گلزار نے کیا۔ اس موقعے پر کونسل سے شائع شدہ کلیاتِ پریم چند کی پانچ جلدوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس سمینار میں ہندی اور اردو کے درج ذیل ناقدوں اور دانش وروں نے پریم چند اور ہندستانی زبان کے حوالے سے مقالے پیش کیے اور بحث میں حصہ لیا۔ پروفیسر آلوک رائے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شکیل الرحمن، پروفیسر کے۔ کے۔ گوینکا، پروفیسر ہریش نارنگ، پروفیسر ہردیال، پروفیسر مہاویر سرن جین، جناب مدن گوپال، پروفیسر گنگا پرساد ومل، بھیشم ساہنی، جناب گلزار، خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب رتن سنگھ، پروفیسر صادق، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر مظہر مہدی، ڈاکٹر انور پاشا، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر نبیر رانگڑا اور ڈاکٹر راج کمار سینی۔

ابتدائی اجلاس میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ پریم چند کی تحریریں ہمارے قومی ادب کا سرمایہ ہیں چنانچہ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو یکجا محفوظ کر دینے کا بیڑا اٹھایا ہے اور یہ کام تیزی سے جاری ہے۔

[illegible]

قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر مراکز میں تعلیم کے معیار کو متعین کرنے اور ان کی بہتر کارکردگی کے لیے لائحۂ عمل مرتب کرنے کا کام مانیٹرنگ کمیٹی کرتی ہے جس کی میٹنگیں حسب ضرورت منعقد ہوتی ہیں۔ کمیٹی کی آٹھویں میٹنگ 13/دسمبر کو ہوئی جس میں ڈاکٹر آر کے آنند (ممبر سکریٹری) پروفیسر مشتاق احمد پیر، جناب ایم پی گوئل، ڈاکٹر آبشار عالم اور جناب این کے اگروال (اراکین) نے شرکت کی۔ کمیٹی نے اس بات پر اظہار اطمینان کیا کہ اردو داں طبقے کے طلبہ کے لیے کمپیوٹر تربیت کی یہ اسکیم بیحد کامیابی سے چل رہی ہے اور کونسل کے ذریعے پہلی بار روزگار مرکوز اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی تعلیم ہندستان کے دور دراز خطوں اور مضافات تک پہنچ رہی ہے۔ اس بات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی کونسل کے 75 کمپیوٹر مرکزوں کے قیام کے باوجود نئے مراکز کھولنے کے لیے لگاتار درخواستیں مل رہی ہیں۔ ان درخواستوں کا مقصد مختلف اردو انجمنوں اور اداروں کے کمپیوٹر مراکز کو تسلیم کرنا اور ان کا الحاق کرنا ہے۔

میٹنگ میں کمپیوٹر مراکز میں ہارڈ ویئر، سافٹ ویئر کی دیکھ بھال نیز طلبہ اور فیکلٹی کے عمومی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا اور ان کے حل کی تجاویز پر غور کیا گیا۔ اس کے علاوہ مراکز میں امتحان کے Pattern پر غور و خوض کیا گیا۔ نئے مراکز کے الحاق سے متعلق درج ذیل تجاویز زیر غور رہیں:

- ملحقہ مراکز کو تمام نصاب اور اردو سافٹ ویئر کونسل کی جانب سے مفت فراہم کیا جائے گا۔
- ملحقہ مراکز قومی اردو کونسل کے متعین کردہ انھی ضوابط کے پابند ہوں گے جن کا نفاذ موجودہ مراکز میں ہو چکا ہے۔
- صرف انھی مراکز کو الحاق دیا جائے گا جو ایک نیا مرکز کھولنے کے لیے کونسل کی تسلیم شدہ شرائط پوری کرتے ہوں، یعنی وہ آفس، کلاس روم، لیب، کمپیوٹروں اور پرنٹروں کی تعداد، ان میں سافٹ ویئر کا Configuration، فیکلٹی اور طلبہ کی تعداد، وغیرہ کے تعین میں کونسل کے طے کردہ ضوابط اور شرائط پوری کرتے ہوں۔
- چونکہ ان مراکز کو کونسل کی طرف سے اخراجات نہیں دیے جائیں گے اس لیے وہ موجودہ فیس سے دوگنی فیس طلبہ سے وصول کرنے کے مجاز ہوں گے۔

میٹنگ میں پانچویں مرحلے کے پچیس نئے مراکز کھولنے کی تجویز بھی پاس کی گئی۔ اس کے علاوہ موجودہ مراکز کو کچھ شرائط کے ساتھ شارٹ ٹرم کورسز شروع کرنے کی اجازت بھی دی گئی تاکہ ان سے ہونے والی آمدنی متعلقہ مراکز کے کارپس میں رہے اور بہ وقتِ ضرورت کمپیوٹر Up-gradation میں کام آئے۔

[illegible]

قومی اردو کونسل نے معاصر علوم کی اردو زبان میں منتقلی کے لیے جو عملی اقدام کیے ہیں ان میں مختلف علوم کی اصطلاحات کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے تاکہ مترجمین کے کام میں یکسانیت ہو اور ایک لفظ کے لیے ایک ہی اصطلاح رائج ہو جائے۔ یہ زبان کے استحکام کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اب تک کونسل نے سائنس، سیاسیات، طب وغیرہ کی اصطلاحات شائع کر دی ہیں۔ کامرس کی اصطلاحات کے لیے ریویو کمیٹی بنائی گئی ہے جس کے چیرمین ڈاکٹر ریاض عمر، (پرنسپل ذاکر حسین کالج (شام) ہیں۔ گذشتہ تین ماہ میں 3 ورک شاپ ڈاکٹر عمر کی صدارت میں کونسل کے دفتر میں منعقد ہوئے جس میں پروفیسر شاہ وسیم (علی گڑھ)، ڈاکٹر ایم مصطفےٰ، ڈاکٹر نسیم احمد شاہ افتخار علوی (دہلی) اور ڈاکٹر ایس اے ایس رضوی نے شرکت کی۔ ان ورک شاپوں میں تقریباً پانچ ہزار اصطلاحوں کو غور و فکر کے بعد فائنل کیا گیا۔

[illegible]

قومی اردو کونسل ملک بھر میں منعقد ہونے والے کتاب میلوں میں اپنا اسٹال لگاتی ہے تاکہ اردو کی Visibility بڑھے اور اردو داں حلقوں میں کتب بینی کے شوق کو فروغ ملے۔ گذشتہ تین ماہ میں اردو کے اوّلین تاریخی کتاب میلے کے علاوہ کونسل نے روہنی دتی میں منعقدہ چلڈرن بک فیئر میں شرکت کی۔ یہ میلہ 15 سے 19/ نومبر کے دوران لگایا گیا۔ پٹنہ میں 8 سے 20/دسمبر کے درمیان منعقدہ کتاب میلے میں اور 30/دسمبر سے 5/جنوری تک ممبئی کتاب میلے میں کونسل نے اپنے اسٹال لگائے۔

اردو خبرنامہ

مرزا غالب کی حویلی بصورت "یادگار غالب"

نئی دہلی۔ 27/ دسمبر۔ فصیل بند شہر کی گلی قاسم جان میں آج ایک سرکاری تقریب میں اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حویلی کو "یادگار غالب" کی شکل میں قوم کے حوالے کر دیا گیا۔ غالب کے یوم پیدائش کے موقع پر ہوئی اس تقریب میں دلی کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر وجے کپور نے یادگار غالب کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ دلی حکومت نے مرزا غالب کے شایانِ شان یادگار غالب قائم کرنے کا جو عزم کیا تھا، آج وہ پورا ہو رہا ہے۔ مسٹر وجے کپور نے امید ظاہر کی کہ یادگار غالب پرانے شہر میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز ثابت ہوگی۔

وزیر اعلا مسز شیلا دیکشت نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ یادگار غالب کو اردو تہذیب، ادب اور ثقافت کا اہم ترین مرکز بنانے کے لیے دلی حکومت ہر ممکن کوشش کرے گی۔ مسز شیلا دیکشت نے مشورہ دیا کہ غالب کی حویلی سے منسلک خالی جگہ کو بھی مناسب طریقے سے ترقی دی جائے۔ دلّی کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر وجے کپور نے وزیر اعلا کے اس مشورے کی تائید کی۔

تقریب میں دلّی کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر نریندر ناتھ، بلی ماران سے کانگریس ممبر اسمبلی مسٹر ہارون یوسف، مالیاتی کمیشن کے چیرمین مسٹر اے ایم خسرو، ممتاز اردو دانشور پروفیسر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور ممتاز اردو شاعر مسٹر شاہد ماہلی، رقاصہ اوما شرما، دلّی اردو اکادمی کے سکریٹری مسٹر منصور عثمانی سمیت اردو کے کئی دانشور او رادیب موجود تھے۔

قابلِ ذکر ہے کہ 9/ اگست 1997ء کو دلّی ہائی کورٹ کے جج جسٹس سی ایم نیّر نے فیصلہ دیا تھا کہ چھے ماہ کے اندر غالب کی حویلی کو اپنے قبضے میں لے کر حکومت وہاں یادگار غالب قائم کرے۔ اس کے بعد غالب کے پرستاروں اور دلّی حکومت نے مل کر یادگار غالب کے قیام میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ بڑی جدوجہد کے بعد حویلی کو حکومت نے اپنے قبضے میں لیا اور وہاں یادگار غالب بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں دلی کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر وجے کپور کی صدارت میں ماہرینِ غالب پر مشتمل ایک اعلا سطحی کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی کی نگرانی میں یادگار غالب کا قیام عمل میں آیا۔ فی الحال غالب کی حویلی کا ایک حصہ (138) مربع گز ہی قبضے میں لیا جاسکا ہے جس پر یہ یادگار قائم کی گئی ہے۔ یہاں غالب سے متعلق تصاویر، ان کی تحریریں، کتابیں اور دیگر چیزیں نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔ اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ غالب سے نہ سہی، غالب کے عہد سے تو ملاقات ہو ہی گئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس نمائندے کو غالب کی حویلی کا وہ کمرہ بھی دکھایا جس میں بیٹھ کر غالب نے کہا تھا" یہ بندۂ کمینہ ہم سایۂ خدا ہے"۔ لیکن یہ کمرہ فی الحال یادگار غالب کا حصہ نہیں ہے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

اردو کی ترقی کے لیے بجٹ میں تین گنا اضافہ

نئی دہلی۔ 15/ دسمبر، (یو این آئی) انسانی ذرائع کی ترقی کے وزیر جناب مرلی منوہر جوشی نے آج اس بات سے انکار کیا کہ حکومت اردو کو نظر انداز کر رہی ہے۔ مسٹر جوشی نے کہا کہ حکومت نے تو اس کے برعکس اردو کی ترقی کے لیے اپنے بجٹ میں تین گنا اضافہ کیا ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ اس حکومت نے اردو کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کا مقابلہ پچھلے 50 سال میں اردو کے لیے کیے گئے کام سے کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر جوشی راجیہ سبھا میں جناول کے عبید اللہ خاں اعظمی کی طرف سے اٹھائی گئی خصوصی بحث میں شرکت کر رہے تھے۔ مسٹر جوشی نے کہا کہ حکومت نے اردو مدرسوں میں کمپیوٹر مہیا کرنے کی اسکیم بھی شروع کی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

حکومت اردو کو فروغ دیتی رہے گی

نئی دہلی۔ 19/ دسمبر، آج حکومت نے لوک سبھا میں اعادہ کیا کہ وہ اردو زبان کو فروغ دیتی رہے گی اور پورے ملک میں ایک سو کمپیوٹر تعلیمی مرکز کھولے گی۔ مسلم لیگ کے رکن مسٹر جی ایم بنات والا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر فروغ انسانی وسائل جناب مرلی منوہر جوشی نے کہا کہ گذشتہ چند برسوں میں اردو کے فروغ میں 45 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ حکومت اردو سکھانے والے اسکولوں کو کافی رقوم بھی مہیا کر رہی ہے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

[illegible]

پونے۔ دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونے میں واقع قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر تربیتی مرکز کا جلسہ تقسیم اسناد 14/نومبر 2000ء کو منعقد ہوا۔ اس مرکز سے 45 طلبہ اور طالبات نے جون 2000ء میں ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی میں تعلیم مکمل کی ہے۔ اس کورس میں شیخ عائشہ رئیس نے 91% نمبر حاصل کر کے اوّل پوزیشن حاصل کی۔ باقی سبھی طلبہ نے اچھے نمبروں سے کورس مکمل کیا۔ تقسیم اسناد کی رسم جناب ایس ایس پہاری، پروگرام کو آرڈی نیٹر، C-DAC پونے نے ادا کی۔ وہ جلسے کے مہمانِ خصوصی بھی تھے۔

(ڈاک سے)

غالب اکیڈمی میں غالب خطبہ

نئی دہلی۔ 7/جنوری، مرزا اسد اللہ خاں غالب کے 203ویں یوم ولادت کے موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے غالب اکیڈمی میں غالب خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ سید شہاب الدین سابق ایم پی نے اردو ذریعہ تعلیم، اردو معاشرہ اور قومی پالیسی کے عنوان سے اپنے خطبے میں کہا کہ اردو بین الاقوامی سطح پر بڑھ رہی ہے لیکن اپنے ہی وطن میں بے وطن ہے۔ بہار، آندھرا پردیش، دہلی اور اتر پردیش میں اسے جزوی طور پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ شمالی ہند میں اردو معاشرے کے 52 فی صد لوگ اردو کو اپنی مادری زبان مانتے ہیں جب کہ جنوبی ہند میں اوسط زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دس فی صد اگر اردو بولنے والے ضلع میں نہ ہوں تو جس تحصیل میں ہوں، جس بلاک میں ہوں، جس گاؤں میں ہوں وہاں انھیں سہولیات ملنی چاہئیں۔ تعلیم کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے میڈیم کو ہمیں درجہ پانچ تک محدود کرنا ہوگا درجہ چھے سے دس تک کے لیے اردو تعلیم پر زور دینا ہوگا۔ تین سو کی آبادی پر اردو میڈیم اسکول کھلوانے کی بات کرنا چاہیے۔ مرکزی حکومت کے تعلیم پر خرچ ہونے والے بجٹ کا 6 فیصد اردو کو ملنا چاہیے۔ دنیا نئی تہذیب کی طرف جارہی ہے لیکن ہر لسانی تہذیبی گروہ اپنے تشخص کے ساتھ قائم رہے گا۔ اردو کی روح اس کے رسم الخط میں ہے۔

اس موقع پر کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "پچھلے پچاس برس میں یہ فکر پروان چڑھی کہ انگریزی بولنے والا ہی بڑا عالم ہے جب کہ یہ سچ نہیں ہے۔ لیکن اس کو کیا کریں کہ ایک طرف اپنے تشخص، اپنی تہذیب، اپنی زبان، جڑوں کی پہچان کے لیے تو ہم اردو کے قریب ہیں دوسری طرف انفارمیشن ٹیکنالوجی کا امڈتا ہوا سیلاب ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تعلیمی نظام پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ جب اردو ذریعہ تعلیم کی ضرورت تھی اس وقت یہ سہولت نہیں ملی اب تقاضے بدل گئے اور سماج بدل گیا۔ ماضی کو دہرانے سے مستقبل درخشندہ نہیں بنتا"۔ تقریب کی صدارت خواجہ حسن ثانی نظامی نے اور نظامت ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ اس موقع پر مزار غالب پر گل پوشی و فاتحہ خوانی کی گئی۔ سید فاروق نے غالب اکیڈمی کے شائع کردہ دیوانِ غالب کے ہندی ایڈیشن کا اجرا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

انجمن ترقی اردو شاخ گوالیار کا سالانہ اجلاس

گوالیار۔ انجمن ترقی اردو شاخ گوالیار کی سالانہ کانفرنس، جیواجی یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی کے ہال میں منعقد ہوئی۔ افتتاحیہ اجلاس کی صدارت جیواجی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب وی پی سکسینہ نے فرمائی۔ مہمانِ خصوصی لائف انشورنس کارپوریشن کے ڈویژنل منیجر جناب جی جی پانڈے تھے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں کہا کہ اردو زبان کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا کے 55 ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ اردو کا طالبِ علم بے روزگاری کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ مختلف درجات میں اردو کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین بھی ضروری ہوتے ہیں اس لیے اردو پڑھنے کی وجہ سے اردو طلبہ گھاٹے میں نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے کہا کہ یہ خیال ہمیں اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ اردو مر رہی ہے۔ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہیے اور اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کرتے رہنا ضروری ہے۔

انجمن کے ریاستی صدر پروفیسر آفاق احمد نے بھی اس اجلاس کو خطاب کیا انھوں نے مدھیہ پردیش میں اردو کی صورتِ حال اور انجمن کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ہر قیمت پر اردو کے رسم خط کا تحفظ کرنا ہے۔ مہمانِ خصوصی جناب جی جی پانڈے نے اپنے آبائی وطن لکھنؤ کے حوالے سے اردو زبان کی نزاکت اور لطافت کا ذکر کرتے ہوئے مہذب سماج کی تشکیل کے لیے اردو کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا۔ افتتاحیہ اجلاس کی صدارت کے فرائض انجمن کی مقامی شاخ کے صدر اور جیواجی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ونود پرکاش سکسینہ گلزار گوالیاری نے انجام دیے۔ آپ نے کہا کہ یونیورسٹی جنوری 2001ء سے اردو میں ڈپلوما کورس اور آئندہ تعلیمی

سال سے ایم اے اردو کی کلاسیز شروع کرنے جارہی ہے۔ اس طرح یہاں پی ایچ ڈی کرنے کی سہولت بھی ہو جائے گی۔ آپ نے کہا یونیورسٹی میں زبانوں کے سینٹر کا قیام بھی عمل میں آرہا ہے جس میں اردو بھی شامل ہوگی۔ ڈاکٹر سکینہ نے کہا کہ اردو کسی خاص فرقے کی زبان نہیں یہ ہندستان کے عوام کی زبان ہے۔ پیار اور بھائی چارے کی زبان ہے جس کی مٹھاس کی لہر کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلی ہوئی ہے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض انجمن کے سکریٹری سہیل احمد قریشی نے انجام دیے۔

افتتاحیہ اجلاس کے بعد "اردو اور اکیسویں صدی" کے موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر خلیق انجم نے فرمائی۔ انجمن کے ریاستی سکریٹری وقار صدیقی نے اپنا مقالہ "اکیسویں صدی میں اردو" پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگلی صدی کمپیوٹر کی صدی ہوگی اور اس میں لفظوں کی بہتات کے بجائے جامعیت اور ہمہ گیری پر زور ہوگا اور ان دونوں معاملات میں اردو ادب کو وہ خصوصیت حاصل ہے جو اس کی کسی دوسری ہم عصر زبان کو شاید ہی حاصل ہو۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ اگلی صدی اردو کے اختصار اور جامعیت کے لیے مزید سہولت اور مقبولیت فراہم کرے تو بیجا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے اپنے مقالے میں کہا کہ آنے والا دور سیکولرازم اور جمہوریت کے فروغ کا دور ہوگا جس میں اردو کو بھی فروغ حاصل ہوگا کیونکہ اردو کا خمیر ہی سیکولر اور جمہوری ہے۔ پروفیسر آفاق احمد نے اردو زبان کی متعدد خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو بیسویں صدی کی زبان بھی تھی اور 21ویں صدی کی زبان بھی ہوگی۔

لنچ کے وقفے کے بعد تنظیمی اجلاس شروع ہوا۔ جس کی صدارت صوبائی صدر پروفیسر آفاق احمد نے کی انجمن کی مقامی شاخ کے جنرل سکریٹری صغیر احمد انصاری نے انجمن کی سرگرمیوں کی ایک سال کی رپورٹ پیش کی نیز دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی۔ رپورٹ پر وقار صدیقی، انیس، ڈبلو خلجی اور پروفیسر عبدالجمیل قریشی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رپورٹ کی تائید کی رپورٹ اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

کانفرنس کے اختتام کی آخری کڑی مشاعرہ تھا جس کی صدارت ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے کی اور نظامت کے فرائض محترمہ کادمبری آر یہ نے انجام دیے۔ پروگرام کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہال شروع سے آخر تک سامعین سے بھرا رہا اور خواتین نے بھی خاصی تعداد میں شرکت کی۔ (ندیم، بھوپال)

بیداری و مستعدی سے [illegible] انجمن ترقی اردو بہار کی اپیل

پٹنہ۔ 21/دسمبر، ٹائمز آف انڈیا پٹنہ وغیرہ میں اس اعلان کی اشاعت پر کہ 2001ء کی مردم شماری 9 سے 28/فروری تک پورے ملک میں ہوگی، پروفیسر عبدالمغنی صدر انجمن ترقی اردو بہار نے اردو آبادی سے عام اپیل کی ہے کہ وہ ابھی سے اپنے صحیح اندراج کے لیے بیداری و مستعدی کے ساتھ پورا انتظام شروع کردے۔ اس لیے کہ دس سال پر ہونے والی یہ مردم شماری ہی آبادی کے وہ اعداد و شمار فراہم کرتی ہے جن کی بنیاد پر اگلے دس سال میں تمام جمہوری اقدامات خاص کر حکومت کی طرف سے فیصلے کیے جاتے ہیں اور ہر طبقہ ان کے حوالے سے اپنے آئینی حقوق کے مطالبات کرتا ہے۔

صدر انجمن نے مزید کہا ہے کہ اردو آبادی کی صحیح اور پوری تعداد کا اندراج عام طور پر اعداد و شمار کے فارم بھرنے والے نہیں کیا کرتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد جہاں تک ہوسکے کم کر کے دکھائی جائے۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو بہار کی تمام شاخوں اور کارکنوں کو ہدایت اور تمام اردو دوستوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ گاؤں گاؤں، شہر شہر، محلّے محلّے کمیٹیاں بنا کر اس بات کا موثر بندوبست کریں اور اپنے سامنے مردم شماری کے فارم میں لکھوائیں کہ ان کی پہلی اور مادری زبان اردو ہے۔ (ڈاک سے)

"روزگار سماچار" اور "آج کل" جاری رہیں گے

نئی دہلی۔ 26/دسمبر (یو این آئی) مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات محترمہ سشما سوراج نے آج دور درشن کیندر کے عہدیداروں کو ہدایت دی ہے کہ دور درشن کیندر پٹنہ کے اردو نیوز بلیٹن کے اسٹاف کی مجوزہ تخفیف کو فوراً روک دیں اور اس سلسلے میں انھیں ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی جائے۔

یہ اقدام محترمہ سشما سوراج نے رکن راجیہ سبھا مسٹر کے۔ ایم۔ خان کی ایک نمائندگی پر کیا جنھوں نے مرکزی وزیر سے ملاقات کر کے دور درشن کیندر پٹنہ کے اردو اسٹاف کی تخفیف اور اس سے بہار کے اردو حلقوں میں پیدا شدہ ناراضگی اور احتجاج سے انھیں واقف کروایا۔ مسٹر خان کی پریس ریلیز کے مطابق محترمہ سشما سوراج نے انھیں یقین دلایا کہ ان کی وزارت میں اردو والوں سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور وہ جز وقتی ملازمین کا پیٹ کاٹ کر حکومت کے مصارف میں کفایت پر یقین نہیں رکھتی ہیں۔ وہ اپنی وزارت میں اردو کی ممکنہ ترویج کی کوشش کریں گی۔ انھوں نے مسٹر کے ایم خان کو بتایا کہ اردو کے 'روزگار' سماچار' اور 'آج کل'

کو بند کرنے کی جو تجویز زیرِ غور تھی ارکان پارلیمان کی نمائندگی پر حکومت نے اس تجویز کو ختم کر دیا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

جزوقتی اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ

نئی دہلی۔ دہلی سرکار نے پنجابی، اردو اور سنسکرت اکادمیوں میں کام کرنے والے جزوقتی اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافے کا اعلان کیا ہے۔ نیا پے اسکیل یکم جولائی 2000ء سے نافذ مانا جائے گا۔ نیا پے اسکیل تیس فی صد اضافے کے ساتھ نافذ کیا گیا ہے۔ ایک پریس ریلیز کے مطابق تنخواہ میں اضافے کا فائدہ سرکار کے محکمہ تعلیم کے ذریعے چلائے جا رہے سرکاری اسکولوں میں کام کرنے والے ووکیشنل جزوقتی اساتذہ کو بھی ملے گا۔ ان کا نیا پے اسکیل 3500 سے بڑھا کر 5000 روپے کر دیا گیا ہے۔ تنخواہ میں اضافے سے 900 ووکیشنل جزوقتی اساتذہ اور 982 تربیت یافتہ / غیر تربیت یافتہ جزوقتی اساتذہ کو فائدہ ہوگا۔ (ہماری زبان، دہلی)

ہونہار طلبہ وطالبات کو انعام، ٹیچروں کو شیروانی ایوارڈ

نئی دہلی۔ 14 دسمبر۔ پیش ہیں آگرہ کمشنری کے تین اداروں میں 2000ء کے بورڈ امتحانوں میں اپنے اداروں میں اعلا پوزیشن حاصل کر کے شیروانی انعامات جیتنے والے دس ہونہار ترین طلبہ وطالبات اور اپنے اپنے مضمون میں نتیجہ بہتر کر کے ایوارڈ جیتنے والے 13 لائق ومحنتی ٹیچرز کے نام:

صغیر فاطمہ، محمدیہ گرلز کالج، آگرہ

انعام جیتنے والی طالبات ہائی اسکول:

رضیہ خاتون۔ انٹر: زینت خاتون، راحیلہ خاتون، ڈولی، واجدہ تبسم، صبا انجم۔

ایوارڈ جیتنے والی ٹیچرز:

افسری یوسف (ہندی)، روبینہ (ہوم سائنس)، خلیق جہاں (فزکس) فرحت بانو (ہسٹری) سنتوش نیر (اکنومکس)، شردھا سنیاسیا (ہندی)، صفیہ علی (انگلش)، شگفتہ پروین (سوشل سائنس) اور نکہت پروین (ہوم سائنس)۔

مولانا آزاد نسواں گرلز کالج، فیروز آباد:

انعام جیتنے والی طالبات، انٹر: صائمہ ریاض اور سنبل غیاث۔

ایوارڈ جیتنے والی ٹیچرز: آمنہ خانم (ہندی، اردو)، جہاں آرا (ڈرائنگ) اور سلمیٰ نصیر (سوشل سائنس)

مصطفیٰ رشید شیروانی ہائر سیکنڈری اسکول (زنگیج ڈنڈوارہ) ایٹہ:

انعام جیتنے والے طلبہ: محمد ندیم اختر اور گیان سنگھ۔

ایوارڈ جیتنے والے ٹیچر: اے کے گپتا (ہندی)۔

اس سے پہلے ایک رپورٹ میں ضلع ایٹہ کے مقامات کاسگنج، نیولی اور سہاور میں انعامات جیتنے والے اکیس ہونہار ترین طلبہ وطالبات اور اٹھارہ ٹیچرز کے لیے ایوارڈ کا اعلان ہو چکا ہے۔ آگرہ کے انوری نیلوفر گرلز کالج، احمدیہ حنفیہ کالج اور شعیب محمدیہ کالج اور فیروز آباد کے شریمتی صغریٰ بیگم گرلز کالج اور اسلامیہ کالج سے ابھی تک 2000ء کے نتیجے نہیں آئے ہیں۔ گویا ان پانچ اداروں کے ذمے داران اپنے اپنے کالج کے ہونہار ترین طلبہ وطالبات کو انعامات سے محروم کرا رہے ہیں۔ یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کوئی ان سے پوچھنا چاہے تو پوچھے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

جدید تعلیم کا فروغ وقت کی اہم ضرورت

نئی دہلی۔ 17 دسمبر۔ جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سیّد احمد بخاری نے کہا ہے کہ آج تعلیم کو گھر گھر پہنچانے کی ضرورت جتنی شدید ہے اس کا اعتراف تو کیا جانے لگا ہے لیکن اس اعتراف کے ساتھ جتنی سرگرمی سے تعلیم کو پھیلانے کے لیے کام کیا جانا چاہیے ابھی اس کی کمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے دینی تعلیم جتنی اہم ہے، اتنی ہی جدید علوم کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ جدید علوم میں اس دور میں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بڑا اہم مقام حاصل کر لیا ہے، جس کی طرف دھیان دیا جانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے ان خیالات کا اظہار ابوالفضل انکلیو میں واقع انفامیٹیکا فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام ایک تقریب میں کیا۔ اس موقعے پر فاؤنڈیشن کے صدر سید شاہد علی، نائب صدر سیّد رضا مہدی اور جوائنٹ سیکریٹری سیّد سعد علی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ (قومی آواز، دہلی)

ہندوستانی زبانوں میں ویب سائٹ پر کانفرنس

نئی دہلی۔ 7 دسمبر۔ سی ڈی اے سی اور سرکاری زبان کے محکمے نے کل یہاں "بھارتی زبانوں میں ویب سائٹ پیش رفت ومسائل کا حل" کے موضوع پر ایک کانفرنس کا انعقاد کیا۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے سرکاری زبان کے محکمے کے سکریٹری شری اشوک کمار نے وزارتوں اور محکموں سے کہا ہے کہ وہ جہاں بھی ضروری ہو اور جب کبھی بھی درکار ہو ہر محکمہ اور وزارت اپنی اپنی ویب سائٹ قائم کرے۔ انھوں نے کہا کہ www کمپیوٹر نیٹ ورک میں کوئی نیا تصور نہیں ہے اور ہمارے یہاں تو

زمانۂ قدیم سے ہی "واسودھیو کٹم کم" کا نظریہ کار فرما ہے۔

شری اشوک کمار نے کہا کہ انٹرنیٹ اور ویب سائٹ نظام کی فراہمی کے ساتھ دنیا چھوٹی سے چھوٹی ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ اس کانفرنس کے مندوبین کو اپنے متعلقہ مسائل اور شبہات دور کرنے میں مدد ملے گی۔ شری اشوک کمار نے مندوبین کو لگن محنت اور دیانت داری سے کام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے والی زبان اردو کو بھی فروغ دینے کی کوشش جاری رکھنے کی تلقین کی ہے۔ (قومی آواز نئی دہلی)

نادر و نایاب کتابوں کی نمائش

نئی دہلی۔ 19 / دسمبر۔ پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے مقابل واقع ہردیال لائبریری میں قدیم و نادر کتابوں کی ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش میں متعدد بادشاہوں، ادبا، شعرا اور دیگر مفکروں اور فلاسفروں کی نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کو علم وادب کے اہلِ ذوق حضرات کے استفادے کے لیے رکھا گیا۔

نمائش میں شہنشاہ اکبر کے ایک نورتن ابوالفضل کی فارسی میں لکھی گئی مہابھارت، خواجہ حسن نظامی کا قرآن شریف کا ہندی ترجمہ جس میں ایک طرف بادشاہ اورنگ زیب کی لکھی ہوئی قرآن کی آیات اور اس کے مقابل اس کا ہندی ترجمہ و تفسیر بیان کی گئی ہے، رکھا گیا۔ 1919ء میں شائع شدہ "واقعات دارالحکومت" کا اصل نسخہ اور لندن سے 1677ء میں شائع ہونے والی والٹر ریلے کی عالمی شہرت یافتہ تصنیف Travel and History of the World جیسی نادر کتابیں بھی شامل تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو ریفریشر کورس

بنگلور۔ 30 / دسمبر، بنگلور اکاڈمک اسٹاف کالج بنگلور یونیورسٹی بنگلور کے زیر اہتمام منعقدہ پہلے اردو ریفریشر کورس کے انیسویں دن پروفیسر عابد صفی وائس چیرمین ٹمل ناڈو اردو اکادمی، ڈاکٹر سیّد سجاد حسین پروفیسر شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی چینئی اور سیّد منصور علی ندوی صاحب نے شرکا سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر عابد صفی نے فورٹ سینٹ جارج کالج کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ کالج فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے 1717ء میں قائم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کلکتہ منتقلی کے ساتھ ہی کالج کی مقبولیت متاثر ہو گئی۔ اس کالج نے دکھنی زبان وادب کی ترقی و ترویج میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ اس کالج میں تصنیف و تالیف، لائبریری اور تعلیم و تدریس کے شعبے تھے۔ یہ کالج جو ابتدا میں رائٹرز کالج کے نام سے مشہور تھا قدیم صوبہ کرناٹک میں بولی جانے والی دکھنی زبان انگریزوں کو سکھانے کے لیے کھولا گیا تھا۔ پروفیسر سیّد سجاد حسین نے عہد والا جاہی کی ادبی خدمات کے عنوان پر لیکچر دیا۔ آپ نے والا جاہی دور میں مروج دکھنی یا کرناٹکی کہلانے والی زبان کے فروغ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ والا جاہی دور اردو ادب کا سنہری دور ہے۔ والا جاہی نوابین نے اپنے ایک سو سالہ دورِ حکومت میں وسیع النظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا۔ والا جاہی نواب شعرا اور ادبا کے اتنے زیادہ قدرداں تھے کہ جب لکھنؤ سے بحر العلوم آرکاٹ تشریف لائے اور پالکی میں محل پہنچے تو محمد علی والا جاہی نے آگے بڑھ کر پالکی کو کندھا دیا تھا۔ آپ نے مزید کہا کہ ایسے ادب پرور نوابین کی سرپرستی میں دکھنی نثر وادب کو کافی بڑھاوا ملا۔ ایک ایسے دور میں جب کہ نثری نگارشات کا رواج عام نہیں تھا اور ہر طرف شاعری کا دور دورہ تھا والا جاہی نوابین کی سرپرستی میں یہاں کے ادبا و شعرا نے نثر میں یادگاریں چھوڑی ہیں تاہم ادبی حلقوں کی بے توجہی کے سبب یہ تمام ادبی سرمایہ گمنامی میں چلا گیا۔ آپ نے کہا کہ اس دور کے ایک ہزار سے زائد قلمی مخطوطے ہنوز مدراس کے مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ قبل ازیں ڈاکٹر زینت النساء کے گروپ نے ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری پر مقالہ پیش کیا۔ گروپ میں پروفیسر محمد حفیظ اللہ، پروفیسر نجم الدین باگ اور شہر بانو شامل تھیں۔ ڈاکٹر زینت النساء نے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ نذیر احمد کی ناولوں میں صحت مند گھریلو ماحول بنانے میں عورت کی اہمیت کی عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے ناولوں کے فنی پہلوؤں سے بھی بحث کی اور ادب میں ان کی قدر و قیمت کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا۔ (سالار بنگلور)

پرائمری تعلیم کو دلچسپ بنانے کا فیصلہ

کلکتہ۔ 13 / دسمبر، حکومت نے مغربی بنگال میں پرائمری تعلیم کو دلچسپ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈی پی ای پی کے ٹیکنیکل ڈائرکٹر اتم سمتا کے مطابق بچوں کے لیے روایتی ابواب کا سلسلہ شروع کرنے میں ڈی پی ای پی کے ٹیچروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مذکورہ قومی پروگرام صرف مغربی بنگال میں منعقد کیا جائے گا اور یہ سلسلہ باکوڑہ، بیر بھوم، مرشد آباد، کوچ بہار، شمالی 24 پرگنہ، جنوبی 24 پرگنہ، جنوبی دیناج پور، جلپائی گوڑی، مالدہ اور پرولیا سے شروع کیا جائے گا۔ ان اضلاع کے تمام خستہ حال اسکولوں کی مرمت کرنے کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ مزید کئی لائبریریاں بھی قائم کی جائیں گی تاکہ بچوں کی تعلیمی جانکاری میں اضافہ ہو۔ (اخبار مشرق دہلی)

عنبر بہرائچی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

نئی دہلی۔23/دسمبر،اردو شاعر عنبر بہرائچی کو ان کے شعری مجموعے 'سوکھی ٹہنی پر ہریالی' کے لیے اس سال کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا جارہا ہے۔ عنبر بہرائچی کے علاوہ 7 دیگر شعر سمیت 21 مصنفوں کو اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ انگریزی سمیت 21 زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو دیے گئے ہیں۔ ایوارڈ 25 ہزار روپے نقد اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ ایوارڈ کا اعلان کل شام اکادی کے بورڈ نے کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اخبارات کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ

سماجوادی پارٹی کے قومی جنرل سکریٹری اور راجیہ سبھا ممبر محمد اعظم خاں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ مرکزی حکومت کا محکمہ اشتہارات ڈی اے وی پی (D.A.V.P.) اردو اخبارات کو دیے جانے والے بجٹ میں کٹوتی کررہا ہے۔ انھوں نے گذشتہ روز مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات مسز سشما سوراج سے اردو اخبارات سے متعلق جو سوالات ایوان بالا میں کیے تھے،ان سے یہ حقائق سامنے آئے ہیں۔

محمد اعظم خاں کے ایک سوال کے جواب میں وزیر اطلاعات ونشریات نے راجیہ سبھا کو مطلع کیا کہ سال 2000-1999ء کے دوران ڈی اے وی پی نے اپنے مجموعی بجٹ تقریباً 81 کروڑ 13 لاکھ میں سے اردو اخبارات کو 2 کروڑ 38 لاکھ 75 ہزار 821 روپے کے اشتہارات دیے جو کہ مجموعی رقم کا 2.94 فی صد ہے جبکہ ایک دوسرے سوال کے جواب میں یہ بھی بتایا گیا کہ سال 99-1998ء کے دوران اشتہارات کی مد میں تقریباً 65 کروڑ کی جو رقم خرچ کی گئی تھی اس میں اردو اخبارات کا حصہ 2 کروڑ 37 لاکھ 90 ہزار 491 روپے تھا، یعنی مجموعی رقم کا 3.66 فی صد۔ اس طرح اردو اخبارات کو دیے جانے والے اشتہارات کی مد میں 0.70 فی صد کی کٹوتی کی گئی ہے۔

محمد اعظم خاں کے ایک اور سوال کے جواب میں وزیر اطلاعات ونشریات نے ایوان کو بتایا کہ 30/ستمبر 2000ء تک ڈی اے وی پی نے مجموعی طور پر جن 1930 اخبارات کو اشتہارات کے لیے منظوری دی ہے ان میں اردو اخبارات ورسائل کی تعداد 113 ہے۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں وزیر اطلاعات نے بتایا کہ سال 2000-1999ء کے دوران کل 431 اردو اخبارات ورسائل کے ریٹ کنٹریکٹ کی تجدید کی گئی یا انھیں اشتہارات کے لیے منظوری ملی۔ محمد اعظم خاں کے ہی ایک اور سوال کے جواب میں مسز سشما سوراج نے یہ تسلیم کیا ہے کہ 31/مئی 2000ء تک 129 اردو اخبارات کے ریٹ کنٹریکٹ کی تجدید کی درخواستیں التوا میں پڑی تھیں۔ (خبردار جدید دہلی)

اترپردیش میں اردو بی ٹی سی ٹریننگ پر روک

افضل گڑھ، گلشن ایجوکیشن سینٹر افضل گڑھ میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر گلشن انصاری نے کی اور نظامت ماسٹر ادریس خاں نے۔ مہمان خصوصی جناب آفتاب عالم انصاری نے کہا کہ اترپردیش سرکار نے اردو بی ٹی سی کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور ٹریننگ سینٹروں پر روک لگادی ہے۔ اترپردیش میں جہاں چار سینٹروں پر اردو بی ٹی سی کی ٹریننگ دی جاتی تھی آج وہ بند ہیں۔ اترپردیش سرکار نے جہاں بی ٹی سی درخواست فارم بھروائے وہاں اردو بی ٹی سی کو نظر انداز کیا گیا ہے انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ سرکار دوہری پالیسی اختیار کررہی ہے اور اگر سرکار کو واقعی اردو سے دلچسپی ہے تو فوراً بی ٹی سی کے فارم بھرے جائیں اور ٹریننگ سینٹروں کو چلانے کی اجازت دی جائے۔

ڈاکٹر ایم ایس گلشن انصاری نے کہا کہ مسلمان تعلیم میں بہت پچھڑا ہوا ہے اس لیے مسلمانوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم دینا ضروری ہے۔ مسلمان تبھی ترقی کرسکتا ہے جب اس کے اندر تعلیم ہوگی۔ ڈاکٹر حفیظ احمد نے کہا کہ تعلیم کا نہ ہونا ہی ہماری کمزوری ہے اس لیے ہم پچھڑے ہوئے ہیں اور ترقی نہیں کرپارہے ہیں اس لیے سبھی مسلمان بھائی اپنے بچوں کو تعلیم ضرور دلائیں یہی میری گزارش ہے۔ (ڈاک سے)

[illegible]

نئی دہلی۔ آل انڈیا ملی کونسل صوبہ دہلی کے زیر انتظام غالب اکیڈمی میں اردو اساتذہ کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت پرویز ہاشمی صاحب نے کی جب کہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر منظور عالم اس موقع پر مہمان خصوصی تھے۔ اجلاس میں ایم ایل اے چودھری متین احمد، میونسپل کونسلر اظہر شگوفہ کے علاوہ دہلی کے تمام اردو اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر، پرنسپل، منتظمہ کمیٹیوں کے نمائندگان اور ممتاز ماہرین تعلیم موجود تھے۔

اس موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں دہلی کے وزیر ٹرانسپورٹ جناب پرویز ہاشمی نے کہا کہ اردو کے تدریسی مسائل خود اردو والوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے آج تک برقرار ہیں۔ کیونکہ عموماً والدین

اسکولوں میں جاکر اپنے بچوں کو اردو تعلیم دینے کے لیے ہیڈ ماسٹروں وغیرہ پر زور نہیں دیتے۔

اس موقع پر مہمانِ خصوصی ڈاکٹر منظور عالم نے کہا کہ اردو کے مسائل کو حل کرنے کے لیے والدین اور اساتذہ کو مل کر جدوجہد کرنی ہوگی۔ انھوں نے یاد دلایا کہ جمہوری نظام کے تحت مطالبات بھی جمہوری طور طریقوں کو اپنا کر ہی منوائے جاسکتے ہیں۔ ممبر اسمبلی چودھری متین اور کونسلر اظہر شگوفہ نے بھی اپنی تقریروں میں اردو کے مسائل پر پوری توجہ دینے اور ان کے حل کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کی حمایت کا یقین دلایا۔

اس سے قبل اجلاس کا آغاز کرتے ہوئے ملّی کونسل تنظیمی امور کمیٹی کے رکن ڈاکٹر تسلیم احمد رحمانی نے کہا کہ دہلی میں اردو تدریس کے مسئلے پر ملّی کونسل سنجیدہ ہے۔ ملّی کونسل دہلی کے معاون سکریٹری مشرف حسین نے بتایا کہ دہلی میں تقریباً پچیس ہزار اردو طلبہ ہیں جن کے لیے پانچ سو اردو اساتذہ اور صرف ستّر اردو اسکول ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک سروے کے مطابق دہلی میں تقریباً ڈھائی لاکھ مسلم بچے اسکول نہیں جاتے اور ان بچوں کا کوئی پرسان حال بھی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے دہلی میں اردو اسکولوں کی تعداد بھی ناکافی اور اردو اساتذہ کی بھی شدید کمی ہے۔

دہلی سرکار سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ محکمۂ تعلیم میں اردو شعبہ قائم کیا جائے اور عرصۂ دراز سے خالی اساتذہ کی سینکڑوں اسامیاں بلاتاخیر پُر کی جائیں۔ پندرہ مطالبات پر مبنی میمورنڈم میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ آئی ٹی آئی اور دیگر تکنیکی تعلیمی اداروں میں اردو میڈیم بچوں کو ریزرویشن دیا جائے۔ اقلیتی تعلیمی اداروں میں سرکاری اہل کاروں کی بے جا مداخلت روکی جائے اور اردو والوں کی آبادی کے تناسب سے نئے اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں۔ (ہماری زبان، نئی دہلی)

ساکیت ڈگری کالج میں ایم۔ اے (اردو) کا آغاز

فیض آباد۔ ساکیت ڈگری کالج میں اردو میں ایم اے درجات کھلنے پر کالج کے شعبۂ اردو اور بی۔ اے کے طلبہ اور طالبات نے ایم اے سالِ اوّل کے طلبہ اور طالبات کے لیے ایک استقبالیے کا اہتمام کالج آڈیٹوریم میں کیا جس کی صدارت پرنسپل ڈگری کالج ڈاکٹر ایچ بی سنگھ نے اور نظامت ڈاکٹر سیما شاہ نے کی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر طارق سعید نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے پرنسپل صاحب کی ان کوششوں کا تفصیل سے ذکر کیا جن کی وجہ سے کالج میں ایم اے اردو کے درجات کو حکومت کی منظوری حاصل ہو سکی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر عرفی نے اس موقع پر اپنے والد حکیم ابن صاحب مرحوم کی یاد میں ایم اے فائنل میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طالبِ علم کو حکیم ابن میڈل اور بی۔ اے فائنل میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طالبِ علم کو حکیم ابن صاحب وظیفہ (اسکالر شپ) دیے جانے کا اعلان کیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر ایچ بی سنگھ نے اردو والوں سے اپنا حق چھین کر لینے اور اس کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے کی تلقین کی۔ (ہماری زبان، نئی دہلی)

مہاراشٹر میں 84 نئے اردو اسکولوں کے لیے منظوری

ممبئی۔ 7/دسمبر، حکومتِ مہاراشٹر کے محکمۂ تعلیم نے بالآخر ان 84 اردو اسکولوں کی فہرست جاری کردی ہے جن کا اعلان گذشتہ ماہ وزیر اعلا ولاس راؤ دیشمکھ نے اقلیتی امور سے متعلق کابینہ کی سب کمیٹی میں کیا تھا۔ ان نئے اسکولوں میں 5/ پرائمری، 68 سیکنڈری اور گیارہ ہائر سیکنڈری اسکول شامل ہیں۔ تعلیمی اداروں کو سالِ رواں سے ہی یہ اسکول جاری کرنے کے احکامات دیے گئے ہیں۔ (اردو ٹائمز، ممبئی)

سرونج میں ایک ادبی شام

گذشتہ دنوں "سہ ماہی انتساب" کی طرف سے ہندستان کے مشہور ادیب اور رسالہ "اسباق" پونے کے مدیر اعلا کے اعزاز میں ایک شام نذیر فتحپوری کے نام ڈاکٹر سیفی سرونجی کے مکان پر منعقد کی گئی جس میں بھوپال سے کوثر صدیقی تشریف لائے۔ ان کے علاوہ رضا رام پوری، رہبر جونپوری اور اقبال بیدار نے بھی اس پروگرام میں شرکت کی، صدارت ٹونک سے تشریف لائے ہوئے جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں نے کی اور نظامت کے فرائض شاہد میر صاحب ڈائریکٹر کے۔ وی۔ کے نے انجام دیے۔ جلسے کے اختتام پر ڈاکٹر سیفی سرونجی نے باہر سے تشریف لائے ہوئے مہمان شاعروں ادیبوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

پہلا مہدی نظمی ایوارڈ

غازی آباد۔ 2/جنوری، چودھری بھون، غازی آباد میں غازی آباد جرنلسٹ کلب کی جانب سے حکیم شباب اورنگ آبادی کو مہدی نظمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر دیگر دو اشخاص کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں موتی گوپال تپش کو ادیب لکھنوی اور گووند گلشن کو عشرت کرتپوری ایوارڈ دیے گئے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو سکھانے والی ماچس ڈائری

ناگپور۔ ابھی تک ہم گیتااور قرآن مجید کے مختصر ترین نسخوں کے بارے میں جانتے تھے لیکن اردو زبان سکھانے کے لیے ماچس سے بھی چھوٹی کسی ڈائری کا وجود ہے یہ جان کر آپ کو یقیناً تعجب ہوگا لیکن یہ ڈائری ناگپور میں موجود ہے۔ ناگپور کارپوریشن کے ایک اسکول میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دینے والے مدرس محمد قمر حیات اُردو زبان کو فروغ دینے کے لیے پچھلے 21 سال سے انتھک محنت کر رہے ہیں۔ 1979ء سے وہ بلامعاوضہ اُردو سکھا رہے ہیں۔ اس کام کے لیے وہ 3 ماہ کی کوچنگ کلاسز چلاتے ہیں۔ ماچس ڈائری کے موجد بھیے میشرام نے نہ صرف اُن سے یہ زبان سیکھی بلکہ اس میں مہارت بھی حاصل کرلی۔ اپنے اردو علم کو باقی رکھنے کے لیے انھوں نے سہ ماہی نصاب کو ایک چھوٹی ڈائری میں تحریر کرلیا۔ اتنی چھوٹی سی اس ڈائری کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر دل لگاکر پڑھا جائے تو اُردو یقیناً آہی جائے گی۔

اس ڈائری کے کل صفحات 124 ہیں اور اس کا سائز 4x5.8 سنٹی میٹر ہے۔ بھیے میشرام نے اس ڈائری کا نام رکھا "آؤ اُردو سیکھیں" انھوں نے ماچس سے بھی کم سائز کے ورق کاٹے اور اُس پر نوک دار قلم سے خوبصورت خط میں حروف تہجی، جملوں کی بناوٹ، خط لکھنے کا طریقہ اور کچھ اشعار لکھ ڈالے۔ انھوں نے ہندی رسم خط میں بھی ان باتوں کو لکھ دیا ہے۔ اس طرح کل 124 صفحات لگے۔ اس کے بعد انھوں نے خود ہی جلد چڑھائی اور استعمال کرنا شروع کردیا۔ وہ مراٹھی جاننے والوں کے لیے اُردو زبان سکھانے والی ایک کتاب لکھنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ بھیے میشرام کا خیال ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط کی وجہ سے اردو کو مشکل سمجھتے ہیں وہ غلط فہمی میں ہیں۔ یہ زبان آسانی سے سیکھی جاسکتی ہے۔ (خبر دار جدید، دہلی)

2000 میں اردو نے کیا کھویا کیا پایا

نئی دہلی۔ 31ر دسمبر (یو این آئی) انفارمیشن ٹیکنالوجی کی نئی راہ پر کامیابی کے روشن امکانات کے ساتھ نئی الفی میں قدم رکھنے والی اردو زبان نے بیسویں صدی کے آخری سال 2000ء میں ترقی کی ہمہ جہت منزلیں طے کرنے کے ساتھ کچھ ایسے صدمے بھی اٹھائے ہیں جن کی ٹیس تادیر محسوس کی جائے گی۔

سال 2000ء میں اردو کی نشرو اشاعت کا دائرہ نہ صرف اخبارات و رسائل اور سمعی و بصری پروگراموں کی حد سے تجاوز کرتا ہوا نئے نئے ٹی وی چینلوں تک وسیع ہوا ہے بلکہ آزادی کے 53 برسوں کے بعد ایک بار پھر گنگا جمنی تہذیب کی علامت سمجھی جانے والی اس زبان کا رشتہ روٹی روزی سے استوار ہونے لگا ہے۔

مگر جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں کے مصداق 2000ء کا سال اس لحاظ سے اردو پر بھاری بھی گزرا کہ اس دوران شمع آگہی مولانا ابوالحسن علی (میاں) ندوی، ممتاز ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری، آبروئے غزل مجروح سلطان پوری اور افسانہ نگار و صحافی انور عظیم ہی ہم سے جدا نہیں ہوئے، شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر سید حامد حسین، شہاب جعفری، حفیظ میرٹھی، شاہد عظیم، منظر کاظمی، انجم رومانی، قمر جمیل، ہارون رشید، فوق کریمی، ثقلین حیدر اور سعید انجم کے ساتھ ساتھ آخری لمحوں میں حاجی انیس دہلوی بھی داغ مفارقت دے گئے۔ سپر کمپیوٹر عہد سے گزرتے سال 2000ء میں انٹرنیٹ اور ای۔ کامرس کی سطح پر نشرو اشاعت کے ہنگامے اردو رسائل و جرائد میں بھی گونجتے رہے۔ دوردرشن کے بعد سہارا ٹی وی اور جین ٹی وی پر اردو میں حالات حاضرہ کے پروگراموں کے بعد اب فلک اور الہند کے نام سے باقاعدہ اردو ٹی وی چینلوں کا آغاز ہونے جارہا ہے۔ جہاں اردو کی دنیا صرف اخبارات تک محدود نہیں رہے گی بلکہ ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی پیش کی جائیں گی۔

اردو کے کاز کو آگے بڑھانے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی اور مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیاں بلاشبہ بنیادی رول ادا کررہی ہیں۔ مگر اردو کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے روشناس کرانے اور جدید سائنسی و سماجی علوم میں کام آنے والے کسی بھی نوعیت کے علم سے اردو کو جوڑنے، اردو سافٹ ویئر، مشین ٹرانسلیشن اور اردو Programming کی سہولتیں مہیا کرنے میں اردو کونسل نے خاطر خواہ محنت کی ہے۔ کونسل نے نیشنل بک ٹرسٹ کے اشتراک سے 4 تا 12ر نومبر دہلی میں اپنی نوعیت کے اوّلین اردو کتاب میلے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ 3ر اپریل کو دہلی ریاستی زبان بل منظور کیا گیا جس کے تحت اردو اور پنجابی کو دہلی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ دہلی کی حکومت نے اردو اکادمی کے تعاون سے ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کو 11ر لاکھ روپے کے ملینیم ایوارڈ سے نوازا۔ ممتاز ادیب جوگندر پال بھی فروغ اردو ادب ایوارڈ (دوحہ) سے سرفراز کیے گئے۔ سال 2000ء میں اردو تقاریب کی تعداد اگرچہ کم رہی پھر بھی اردو ناول پر پروگرام (عظیم آباد)، خواتین پر سمینار (دہلی)، محمد رفیع سودا پر سمینار (دہلی)، 'اردو غزل آزادی کے بعد' پر سمینار (راجستھان)

اور جدید اردو تنقید پر الہ آباد میں سیمینار منعقد کیے گئے۔ سارک ممالک کے ادیبوں کی ایک کانفرنس (دہلی) میں جنوب ایشیا میں امن کی بحالی اور آپسی رشتوں کی فہم اور تعاون کے مقصد کو حاصل کرنے کا عزم کیا گیا۔ ہندو پاک مشاعرہ 'جشن بہار' کو بھی اہمیت حاصل ہوئی اور اردو کتب ورسائل کی اشاعت کا بازار بھی گرم رہا۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اردو میں عنبر بہرائچی کے حصے میں آیا تو کتھا ایوارڈ کے لیے سہ ماہی نیا ورق کے مدیر ساجد رشید منتخب کیے گئے۔

جے پور میں اردو اکادمیوں کی تیسری کل ہند کانفرنس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے پورے ملک میں ہائی اسکول کی سطح تک اردو کو نصاب میں شامل کرنے پر زور دیا اور اجلاس کے آخری دن ایک قرارداد منظور کر کے تمام اردو اکادمیوں کو اقتصادی اور ادبی طور پر مضبوط بنانے کے علاوہ آسام، اترانچل، جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ میں اردو اکادمیوں کی تشکیل کی سفارش اور اکادمیوں کے لیے مناسب بجٹ کا مطالبہ کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

وفیات

الحاج انیس دہلوی

یہ خبر ادبی حلقوں میں انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی کہ اردو دنیا کی مشہور و معروف شخصیت الحاج نعمت اللہ انیس دہلوی کا 71 سال کی عمر میں 30/دسمبر کو علی الصباح 3.15 بجے انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً دو ماہ سے علیل تھے۔ ان کی تدفین مہندیان قبرستان میں بعد نماز ظہر 3.30 بجے عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ سات بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ مرحوم کی پیدائش 7/ستمبر 1930ء کو ہوئی۔ باشعور ہوتے ہی صحافتی مشاغل سے وابستہ ہو گئے۔ کم عمری میں ہی اپنے محلے کے لیے دیواری اخبار روزنامہ "اجالا" شروع کیا۔ 1960ء میں ہفت روزہ "ہمارا رہبر" اور پھر 1966ء میں "نرالی دنیا" ڈائجسٹ شروع کیا جس نے ہندستان گیر شہرت حاصل کی۔ "فلمی ستارے" اور ماہنامہ "باجی" آج بھی انتہائی باقاعدگی سے منظر عام پر آرہے ہیں۔ ان کے علاوہ سہ ماہی "ایوانِ ادب" بھی شائع ہو رہا ہے۔ 1997ء میں ان کا مجموعہ کلام "قدم بہ قدم" منظر عام پر آیا اور بہت پسند کیا گیا۔ اسی مجموعے میں انھوں نے "اپنی بات" کی ابتدا میں اپنا یہ شعر لکھا ہے:

ستر برس کی دھوپ گئی سر سے اے انیس
کچھ تجربوں کی دھوپ نے اجلا بنادیا

"قدم بہ قدم" کو دہلی اردو اکادمی کی جانب سے گذشتہ سال خصوصی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "دستِ دعا" زیرِ طباعت ہے۔ مرحوم کے جنازے میں دہلی کی اہم علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی جن میں خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب اسرار احمد (پریس سکریٹری گورنر دہلی)، عظیم اختر، م۔ افضل (سابق ممبر پارلیمنٹ)، منصور احمد عثمانی (سکریٹری اردو اکادمی دہلی)، ہارون یوسف (ممبر اسمبلی دہلی) انیس درانی، اقبال انصاری، ڈاکٹر صلاح الدین، انیس مرزا، پروفیسر فیروز دہلوی، ساقی نارنگ، محمد علی موج، رؤف رضا، انور باری، ایم اے خان، فاروق ارگلی وغیرہ شامل تھے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین

پچھلے دنوں معروف ادیب، محقق اور نقاد ڈاکٹر سید حامد حسین کا بھوپال میں اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے انتقال سے اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اگرچہ وہ انگریزی کے پروفیسر تھے لیکن اردو زبان وادب سے محبت کے باعث انھوں نے جو اہم ادبی خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

ڈاکٹر حامد حسین ایک علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کا پیکر تھے۔ ظاہر پرستی اور اشتہار بازی سے دور رہ کر وہ اپنی علمی ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں خدابخش لائبریری پٹنہ اور مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ مرحوم نے بچوں کے ادب پر بھی متعدد کتب یادگار چھوڑی ہیں۔ مرحوم صحیح معنوں میں اردو کے حقیقی خدمت گزار تھے۔

ملکۂ ترنم نورجہاں

اداکارہ اور ممتاز گلوکارہ ملکۂ ترنم نور جہاں کا ایک طویل علالت کے بعد 23/دسمبر کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ 74 سالہ نور جہاں نے کلکتے میں 5 سال کی عمر میں اسٹیج سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ انھوں نے جب لاہور میں بنائی گئی پنجابی فلم میں 9 سال کی عمر میں ایک رول ادا کیا تھا تو وہ برِ صغیر کی پہلی چائلڈ اسٹار بن گئی تھیں۔ بعد میں انھوں نے اداکاری کو خیر باد کہہ دیا اور پوری طرح گلوکارہ بن گئیں۔ ان کی موت کے ساتھ گائکی کے تقریباً تین چوتھائی صدی پر محیط ایک شاندار عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ ہندستان اور پاکستان میں یکساں طور پر مقبول تھیں۔ "آواز دے کہاں ہے، دنیا مری

جواں ہے" فلم "انمول گھڑی" میں یہ درد بھرا نغمہ غیر منقسم ہندستان میں آج سے تقریباً 60 سال پہلے گایا گیا تھا اور آج کے گانے والے بھی جب یہ گانا گاتے ہیں تو روح بے چین ہو جاتی ہے۔ 1943ء میں اس نغمے کو اپنی درد بھری آواز سے امر بنانے والی گلوکارہ ملکۂ ترنم نور جہاں تھیں اگرچہ وہ پاکستان چلی گئی تھیں لیکن جب بھی ہند ستانی سنیما کی تاریخ مرتب کی جائے گی ان کے نام کو امتیازی اہمیت کے ساتھ اس میں شامل کیا جائے گا۔

ممبئی میں "گاؤں کی گوری" ان کی آخری فلم تھی۔ انھوں نے چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے فلموں میں کام شروع کیا تھا لیکن پہلی مرتبہ انھیں اس وقت پہچانا گیا جب فلم "خاندان" (1942ء) میں انھوں نے یہ گانا گایا "تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا"۔

"جواں ہے محبت، حسیں ہے زمانہ"..... "میرے بچپن کے ساتھی مجھے بھول نہ جانا" ایسے نغمے ہیں جنھیں موسیقی پسند لوگ کبھی بھلا نہیں پائیں گے۔

1929ء میں پنجاب کے قصور علاقے میں پیدا ہونے والی نور جہاں نے بچپن کی عمر سے ہی گانا شروع کر دیا تھا۔ اختری بیگم اور کمن بائی سے انھیں یہ تحریک ملی تھی۔ ان کی شادی ہدایت کار شوکت حسین رضوی سے ہوئی اور ان کی کئی فلموں بشمول "نوکر" (1943) اور "جگنو" (1943) میں انھوں نے کام کیا۔ "جگنو" میں ہیرو کا رول دلیپ کمار نے ادا کیا تھا۔ میاں بیوی کی اس جوڑی نے 1945ء میں کامیاب ترین فلم "زینت" پیش کی اور اسی فلم سے نور جہاں نے فلمی موسیقی کو گانے کا ایک نیا انداز بخشا۔ ہندوپاک میں یکساں طور پر مقبول نور جہاں کو 1970ء کی دہائی میں پاکستان نے "ملکۂ ترنم" کے خطاب سے نوازا۔ برِ صغیر کی اس عظیم گلوکارہ کا بعض اوقات مصر کی ممتاز گلوکارہ ام کلثوم سے بھی موازنہ کیا جاتا تھا۔

وزیر داخلہ ایل کے اڈوانی نے ان کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ اگرچہ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلی گئی تھیں لیکن سرحدوں کے دونوں طرف ہندی اور اردو کے نغمات کا وہ ایک حصہ بنی رہیں۔ انھوں نے کہا کہ نور جہاں کی موت سے برِ صغیر اور دنیا بھر میں ان کے لاکھوں چاہنے والوں کو صدمہ پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بھی ان کے لاکھوں مداحوں میں شریک ہیں اور رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کی روح کو جوارِ امن میں جگہ دے۔

اطلاعات ونشریات کی وزیر محترمہ سشما سوراج نے ملکۂ ترنم نور جہاں کو برِ صغیر کی ایک ممتاز گلوکارہ قرار دیا جن کے خوبصورت نغمے ہندوپاک میں موسیقی پسند لوگوں کے دلوں کو مسلسل گرماتے رہیں گے۔ اپنے تعزیتی پیغام میں انھوں نے کہا کہ نور جہاں کا ہندستان سے گہرا رشتہ تھا اور ان کی موت سے برِ صغیر کی موسیقی ایک اہم گلوکارہ سے محروم ہو گئی۔ محترمہ سوراج نے نور جہاں کی موت پر گہرے صدمے کا اظہار کیا۔

آسان اور عام فہم زبان میں طلبہ کے لیے

ڈپلوما کمپیوٹر اپلی کیشن اور ملٹی لنگول ڈی ٹی پی

قیمت: -/32روپے

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

دیوناگری اور تصویروں کی مدد سے اردو سکھانے والی کتاب

اردو تصویری لغت مع ہندی

صفحات :252 قیمت :-/30روپے

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

طلبہ، اساتذہ اور اسکالروں کو خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن۔

تبصرہ و تعارف

کلیات سراج / سراج اورنگ آبادی

ڈیمائی، 732 صفحات، 138 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بلاک 1، آر کے پورم، نئی دہلی

مرتب: عبدالقادر سروری

مبصر: سرورالہدیٰ

حالیہ چند برسوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی علمی و ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اس کا سہرا کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کے سر جاتا ہے۔ قومی کونسل نے ادبی کتابوں کے علاوہ سماجی تاریخی سائنسی علوم سے متعلق بھی کتابیں شائع کی ہیں اور اب یہ شکایت قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ اردو میں ادب کے سوا دوسرے موضوعات سے متعلق کتابیں نہیں ملتیں۔ کونسل نے کلاسیکی شعر و ادب کو بھی اپنے اشاعتی پروگرام میں نمایاں جگہ دی ہے۔ کلاسیکی ادب سے دوری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ کتابیں مناسب قیمت پر آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ قومی کونسل نے کلیات سراج کی اشاعت کر کے ایک بڑا کام کیا ہے سراج ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنے فکر و فن سے اردو شاعری کو سجانے اور سنوارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سراج نے اپنی متصوفانہ طبیعت سے اردو شاعری کو ایک نئی حلاوت اور چاشنی سے آشنا کیا۔ جو سرمستی و سرشاری ان کی شاعری میں ہے وہ ان کی عملی زندگی کی پیدا کردہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ ان کے یہاں آکر مترنم ہو جاتے ہیں۔ سراج کی بازگشت جدید غزل میں بھی سنائی دیتی ہے:

روتے میں تجھے دیکھ کے حیران ہوا ہوں
کیا وجہ کہ اس ابر میں سورج نکل آیا

سراج

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں مل گئی تری صورت کبھی کبھی

ناصر کاظمی

تمام آیاتِ خوبی ہیں خط و خال
عجب ہے شوخ کا چہرہ کتابی

سراج

وہ چہرہ کتابی رہا سامنے بہت خوبصورت پڑھائی ہوئی

بشیر بدر

میرے جگر کے درد کا چارا کب آئے گا
اک بار ہو چکا ہے دوبارا کب آئے گا

سراج

اس سے کہنا تو تھا جو کہہ نہ سکے
اس سے ملنا تو تھا دوبارا بھی

مخمور سعیدی

کلیات سراج کو عبدالقادر سروری نے مرتب کیا تھا۔ 146 صفحات پر مشتمل ان کا طویل مقدمہ سراج کی شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ انھوں نے سراج کے ہم عصر شعرا اور ان کے بعد کے اہم شعرا سے موازنہ بھی پیش کیا ہے جس سے عبدالقادر سروری کی دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس مقدمے کو سراج کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

کلیات سراج میں 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، 1 قصیدہ، 5 مستزاد 11 مخمس، 1 ترجیع بند، 1 مناجات شامل ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج نے مختلف اصناف اور شعری ہیئتوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ ان کی مشہور ترین مثنوی "بوستان خیال" بھی 11 مثنویوں میں شامل ہے۔ مگر سراج بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ سراج کے بعض اشعار پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ وہ کلیاتِ سراج میں کچھ اور ہیں اور ہم انھیں کسی اور طرح قرأت کرتے ہیں:

چلی سمت غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی

اس شعر میں "سیں" کی جگہ پر "میں" اور "کہو" کی جگہ "کہیں" کا استعمال عام ہے۔ اکثر کتابوں اور مضامین میں یہ شعر اپنی اصل شکل میں نہیں ملتا۔ اسی غزل کا مقطع بھی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ رائج ہے:

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

بے خطری کی جگہ بے خبری کا استعمال تقریر و تحریر میں عام ہے۔ سراج کا ایک اور مشہور شعر ہے:

دو رنگی خوب نہیں یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

"خوب نہیں" کی جگہ "چھوڑ دے" اب بولا اور لکھا جاتا ہے۔ ویسے اس کلیات میں نہیں کی جگہ نہیں چھپ گیا ہے جو کتابت کی غلطی کہی جاسکتی ہے۔

کلیات سراج کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئے گی کہ ہم بہت سارے اشعار استعمال تو کرتے ہیں مگر ان کو ان کی اصل شکل میں استعمال نہیں کرتے۔ سراج کی شاعری میں جن الفاظ کا جس طرح استعمال ہے اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ ہر دور کا ایک لسانی ذوق ہوتا ہے۔ آج اگر کسی کو وجہی کی سب رس پڑھ کر یہ لگتا ہے کہ یہ بھی کوئی زبان ہے تو بھلا اب اس بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ زبان تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ وجہی، سراج کے زمانے میں غالب اور مومن کے دور کی زبان تو استعمال نہیں ہو سکتی تھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے کلیات سراج کو شائع کر کے اردو کے طالب علموں پر احسان کیا ہے۔ اس طرح نئی نسل کے اندر کلاسیکی شعر و ادب کا شعور پیدا کرنے میں قومی کونسل کا ایک بڑا رول رہے گا۔ کلیات سراج کی قیمت بھی بہت مناسب ہے۔ کتابت طباعت وغیرہ کو دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔

●

موازنۂ انیس و دبیر (مطالعہ، محاسبہ، تقابل) / ڈاکٹر ارشاد نیازی
ڈیمائی، 192 صفحات، 200 روپے
ناشر: علی سنز پبلی کیشنز، دہلی-25
مبصر: اظہار احمد ندیم

اردو مرثیہ نگاری میں میر انیس اور مرزا دبیر کے نام بہت اہم ہیں۔ ان دونوں شعرا کا اثر مرثیہ نگاری پر اس قدر رہا کہ ان کے حوالے سے الگ الگ دو گروہ بن گئے۔ انیس کے پرستاروں کا کہنا تھا کہ زبان کی صفائی، سلاست، روانی اور روزمرہ ہی اصل شاعری ہے جبکہ دبیر کے شیدائی شوکت الفاظ اور خیال کی بلند پروازی کو ہی شاعری کی معراج تصور کرتے ہیں۔ ان دو بڑے شاعروں کا تقابل شبلی نعمانی نے "موازنۂ انیس و دبیر" کے نام سے کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے پہلی بار مشرقی میزانِ نقد پر دونوں شعرا کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور بہت سے اصولی مسائل کا جائزہ لیا۔ لیکن "موازنۂ انیس و دبیر" اپنی اشاعت کے دن سے آج تک نکتہ چینی کا شکار رہی ہے۔ کبھی کہا گیا کہ شبلی نعمانی نے ناقد کی بجائے انیس کے وکیل کا فرض انجام دیا ہے اور انتخاب کلام میں بھی جانبداری برتی ہے، جہاں کلامِ انیس کے بہترین حصوں کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے وہاں دبیر کا نسبتاً کمزور کلام سامنے رکھا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ شبلی کا مزاج ہیرو پرستی کا تھا موازنے میں انھوں نے انیس کو تو شعر العجم میں فردوسی کو اپنا ہیرو بنایا۔ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے ان مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے لیکن ان سے ہٹ کر دونوں شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے نہ تو کسی ایک کو بڑھانے کی سعی کی ہے نہ ہی دوسرے کی بے جا عیب جوئی کی ہے۔ ان دونوں فنکاروں کی خصوصیات پر گرد و غبار کی جو دبیز چادر پڑی ہوئی ہے اسے صاف کر کے قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب انیس و دبیر کے عہد کے حوالے سے ہے۔ دوسرا باب "موازنۂ انیس و دبیر" کی ادبی و تنقیدی اہمیت اور اس کے محرکات کے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں موازنہ کے خلاف اور اس کی موافقت میں لکھی گئی کتابوں، رسالوں وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری باب میں تقابلی ادب کی حقیقت، ماہیت اور سماجی، تہذیبی اور لسانی محرکات سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس حصے میں مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ مغرب میں تقابلی ادب کی جو روایت رہی ہے اس کا اجمالی جائزہ لیا جائے نیز مشرقی زبانوں اور خاص طور سے اردو میں اس کی کیا صورت رہی ہے یہ دکھایا جائے۔ اس باب میں انگریزی، ہندی اور اردو کے دانشوروں کی کتابوں اور مضامین سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تقابلی مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

●

مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ / ڈاکٹر نیر جہاں
ڈیمائی، 320 صفحات، قیمت 250 روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ، نئی دہلی-25،
مبصر: کوثر مظہری

ڈاکٹر نیر جہاں نے حرفِ آغاز میں لکھا ہے کہ اس کتاب کا عنوان تھا "شبلی بحیثیت سوانح نگار۔ ایک تنقیدی مطالعہ" جسے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی نے، جس کی مالی مدد سے کتاب شائع ہوئی ہے، "شبلی ایک مطالعہ" سے بدلنے کی تجویز پیش کی۔ اب کتاب کا نام "مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ" رکھا گیا ہے۔ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کی تجویز بالکل مناسب نہیں تھی کیوں کہ "شبلی ایک مطالعہ" کا مطلب ہے شبلی کے جتنے ادبی زاویے ہو سکتے ہیں ان سب کا احاطہ کرنا۔ اس کتاب کا موضوع شبلی کی سوانح نگاری ہے اس لیے ڈاکٹر نیر جہاں کا

سابقہ مجموعہ نام ہی مناسب تھا۔

پروفیسر شمیم حنفی نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ اس کے بعد مصنفہ کا حرفِ آغاز ہے۔ کتاب چھے ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل کے دو حصے ہیں۔ (الف)۔ فنِ سوانح نگاری، ایک مختصر جائزہ (ب)۔ سوانحی ادب کے بنیادی عناصر۔

باب دوم اردو میں سوانح نگاری کی روایت، باب سوم شبلی کا عہد، سوانح اور شخصیت، باب چہارم (الف) شبلی بحیثیت سوانح نگار (اس کے ذیل میں المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، اور سیرۃ النبی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے)، (ب) سوانحی نوعیت کی تصانیف (اس کے ذیل میں ڈاکٹر نیر جہاں نے ان رسالوں کا جائزہ مختصراً پیش کیا ہے جو دراصل شعر العجم کا حصہ ہیں مگر جنھیں مختلف اداروں نے الگ الگ سوانحی رسالوں کی شکل میں شائع کیا ہے۔ جیسے، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، حیاتِ خسرو، حیاتِ سعدی، فردوسی، فیضی، نظامی گنجوی، حیاتِ حافظ، زیب النساء)۔ باب پنجم "شبلی کے معاصر سوانح نگار، ایک موازنہ" کے تحت مصنفہ نے کئی ہم عصر ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ جیسے حیرت دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، مولوی سراج الدین، محمد سعید مارہروی، منشی ذکاءاللہ، عبدالحلیم شرر وغیرہ۔ باب ششم "شبلی کی سوانح نگاری کے امتیازات، قدر و قیمت اور اثرات" ہے اس باب کا عنوان طویل ہے جب کہ "شبلی کی سوانح نگاری کے امتیازات" عنوان کافی تھا پھر "سوانح نگاری میں شبلی کا مرتبہ"۔

ڈاکٹر نیر جہاں نے تحقیق کے دشوار گزار مرحلوں کو طے کرتے ہوئے بڑی دیدہ ریزی سے شبلی کی سوانح نگاری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ امید ہے ان کا یہ کام سراہا جائے گا۔ اس کتاب کی طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔ اس کی پذیرائی ضرور ہونی چاہیے۔

●

سخنہائے گفتنی (جلد اوّل) / پروفیسر اکبر رحمانی

ڈیمائی، 120 صفحات، 40 روپے

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ

مبصر: ابو ظہیر ربانی

اردو میں تعلیمی لٹریچر کی طرف ہمارے ادیبوں اور دانشوروں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے۔ اسی بے التفاتی کے باعث نئی نسل میں ایسے اردو لٹریچر کی کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ اسی کمی کو پروفیسر اکبر رحمانی نے محسوس کیا اور اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ 1974ء میں انھوں نے "آموزگار" کے نام سے ایک تعلیمی رسالہ جاری کر کے ایک بڑی کمی پوری کی۔ تعلیم و تدریس سے ان کی طویل وابستگی رہی ہے۔ اس لیے وہ حکومت کی تعلیمی پالیسی سے پوری طرح باخبر ہیں اور اس کے منفی اور مثبت پہلوؤں سے عوام کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "سخنہائے گفتنی" پروفیسر اکبر رحمانی کے 42 اداریوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اداریے علمی اور ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ ہر اداریہ تعلیم سے متعلق پیش آنے والے مسائل کو زیرِ بحث لاتا ہے نیز ان کے حل کے لیے مختلف تجاویز پیش کرتا ہے۔

مصنف کو تعلیم کی اہمیت کا بھرپور احساس ہے اور یہی احساس انھیں ہمیشہ فعال رکھتا ہے۔ وہ تعلیم کو سماجی، معاشی اور سیاسی پسماندگی دور کرنے کا واحد نسخہ کیمیا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے اداریوں میں اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں کہ صرف مادی ذرائع ملک اور قوم کی ترقی کے ضامن نہیں ہیں کیونکہ ان کا صحیح استعمال تعلیم یافتہ افراد ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ سائنسی انقلابات نے ہمارے نظامِ تعلیم میں جو اہم تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں ان کے افہام و تفہیم کی کوشش بھی ان اداریوں میں کی گئی ہے اور ہمیں آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم نے اس سلسلے میں ذرا بھی کوتاہی کی تو ہمارے مدارس کے مستقبل کو خطرے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ مصنف نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

موصوف کا خیال ہے کہ دینی تعلیم کے لیے علاحدہ دینی مدارس کے قیام کی ضرورت نہیں۔ سرکاری اسکولوں میں بھی دینی تعلیم کا انتظام ممکن ہے۔ بچوں کی معلومات میں اضافہ، افکار میں بلندی، اظہارِ خیال پر قدرت اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لیے درسی کتابوں کے علاوہ غیر نصابی کتابوں اور اخبارات و رسائل کا مطالعہ بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اسکولوں میں لائبریری کے قیام پر بہت زور دیا گیا ہے تاکہ اساتذہ کو تدریسی صلاحیت میں اضافے کا موقع مل سکے، بچے بھی اس سے استفادہ کر سکیں اور ان میں علم کی رغبت پیدا ہو۔ مادری زبان کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس لیے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اسکولوں میں تعلیمی ماحول بنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس بات کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ اساتذہ کے ذریعے معاشرے میں کس طرح کی تبدیلی آسکتی ہے اور قوم کی تعلیمی، سماجی اور معاشی پسماندگی دور ہو سکتی ہے۔ ان تمام

اقدامات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں جن سے اردو زبان کے فروغ میں مدد مل سکے۔ ساتھ ہی اقلیتی اداروں کے تحفظ کے لیے مثبت طریقے اور تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔ اسکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتابوں سے ایسی باتوں کو خارج کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے جن سے بچوں کے ذہن پر منفی اثرات مرتب ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اردو کو اس کا جائز حق دلانے اور اس کی مقبولیت اور فروغ کے لیے اردو داں طبقے پر عائد ذمے داریوں کا احساس دلایا گیا ہے۔ اردو میں املا کی معیار بندی کی ماہرین لسانیات نے ہمیشہ کوشش کی ہے۔ ان میں مسعود حسین خاں، گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں وغیرہ سر فہرست ہیں۔ موصوف نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مفید مشورے دیے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے مختلف امتحانات میں کامیاب ہونے والے مسلمانوں کی تعداد میں کمی کی وجہ ان کے ساتھ متعصبانہ برتاؤ بتایا جاتا ہے، لیکن موصوف اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ انھوں نے اس کی وجہ مسلم امیدواروں میں محنت، لگن، خود اعتمادی، حوصلے کی کمی اور مسابقاتی ماحول کی عدم موجودگی کو قرار دیا ہے۔ کسی ادارے کے خاتمے پر اگر صفحے پر کچھ جگہ خالی رہ گئی ہے تو موصوف نے وہاں ادیبوں، ماہرین علوم اور مفکرین کے تعلیم و تربیت سے متعلق اقوال کو درج کر دیا ہے۔

اس کتاب کے تمام اداریے قارئین کے لیے غور و فکر کے داعی ہیں۔ ہر اداریہ حقیقت پسندی کا نمونہ ہے۔

●

جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس / یاسمین کوثر

ڈیمائی، 286 صفحات، 200 روپے

تقسیم کار انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر۔ دین دیال اپادھیائے مارگ، نئی دہلی۔ 110002

مبصر: پرکاش چندر

جگن ناتھ آزاد کا نام ہندستان کے ماہرین اقبالیات میں نمایاں ہے اگرچہ وہ اپنے کو اس اعزاز کا مستحق نہیں مانتے۔ انھوں نے اقبال پر متعدد کتابیں، درجنوں مقالے اور مضامین لکھے ہیں۔ علامہ کے غیر مطبوعہ اشعار اور مراسلوں کی نشاندہی کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے فیچر لکھے ہیں۔ آزادی کے بعد جب اقبال کو نظریۂ پاکستان کا حامی قرار دیا گیا اور ان کا نام لینا بھی ہمارے ہاں جرم کے مترادف ہو گیا تھا آزاد نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا اور ہندستانی عوام کو اقبال کی صحیح تصویر سے آگاہ کیا۔ نتیجتاً 1977ء میں اقبال ولادت صدی زور شور سے منائی گئی اور اب درجنوں یونیورسٹیوں میں اقبال پر کام ہو رہا ہے۔

'اقبال اور اس کا عہد' کشمیر یونیورسٹی میں دیے گئے تین توسیعی لیکچر ہیں، 'اقبال اور مغربی مفکرین' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال نہ صرف مغربی فکری دھاروں سے واقف تھے انھوں نے ان سے استفادہ بھی کیا اور کئی بار اختلاف بھی 'اقبال اور کشمیر' کا موضوع نام سے ظاہر ہے چونکہ اقبال کے اجداد کشمیری تھے ان کو کشمیر سے روحانی لگاؤ تھا اور ریاست کے غریب مسلم عوام سے گہری دلچسپی لیکن یہ رویہ فرقہ وارانہ نہ تھا۔ "Iqbal, His Poetry and Philosophy" اقبال کی شاعری کے علاوہ ان کے ان توسیعی لیکچروں کا تعارف ہے جو انھوں نے میسور یونیورسٹی کی دعوت پر لکھے اور پڑھے تھے۔ اس میں تین موضوعات 'اقبال کی شاعری کا ہندستانی پس منظر' 'اقبال شاعر اور سیاستداں' اور 'اقبال اس کی شاعری اور فلسفہ' شامل ہیں۔ آزاد نے ہر موضوع کا تفصیلی جائزہ لیا ہے آزاد کی دوسری انگریزی کی کتاب ہے 'Iqbal Mind and Art' جس کے موضوعات پہلی کتاب سے اگرچہ کافی مشابہت رکھتے ہیں مگر حوالے اور وضاحتیں مختلف ہیں اور کچھ نیا مواد بھی رہا ہے۔ ایک مضمون میں آزاد نے اقبال کی تاریخ ولادت پر بحث کی ہے اور تاریخ کا تعین کیا ہے اور یہی اب مستند مانی جاتی ہے۔

آزاد کی دوسری تصنیفات میں 'بچوں کا اقبال' 'اقبال کی کہانی' 'اقبال زندگی شخصیت اور شاعری' اور 'اقبال ایک ادبی سوانح حیات' ہیں۔ 1977ء میں اقبال صدی پر ایک جامع نمائش بھی آزاد نے ترتیب دی تھی جس میں اقبال اور ان کے خاندان کے لوگوں کی تصویریں، خطوط اور مراسلات کے عکس اور تصانیف کے سرورق اکٹھے کیے گئے تھے۔ یہ نمائش سری نگر میں منعقد ہوئی اور پھر دہلی، ممبئی، علی گڑھ، چنڈی گڑھ اور مدراس وغیرہ کے علاوہ تاشقند (سابق سوویت یونین) میں بھی دکھائی گئی۔

یہ سب کتابیں موضوعات کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں اور زیر نظر کتاب میں ہر کتاب کے مشمولات کا ذکر ہے ان کا تجزیہ اور تعارف ہے۔ آخر میں آزاد کی اقبال شناسی کا ایک مجموعی جائزہ ہے۔

یاسمین کوثر نے اس کتاب میں اقبال پر اتنا مواد مہیا کر دیا ہے کہ جو لوگ اقبال پر بہت سی کتابیں نہیں پڑھ سکتے ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کافی ہوگا۔

●

اُفق کی مسکراہٹ / اسلم جمشید پوری
ڈیمائی، 112 صفحات، 60 روپے،
تقسیم کار: بیسویں صدی پبلیکیشنز، نئی دہلی۔25
مبصر: نیر جہاں

اسلم جمشید پوری کے افسانے، رسائل میں چھپتے اور پسند کیے جاتے رہے ہیں۔ "اُفق کی مسکراہٹ" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کل تیس افسانے ہیں، جن میں چند کمزور بھی ہیں، بعض خوب اور بعض بہت خوب ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا مواد عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیا ہے۔

مجموعے کا پہلا افسانہ "ترکیب" ہے جو ہمارے سماجی نظام کے کھوکھلے پن کو اجاگر کرتا ہے۔ جہاں حلال کمائی میں سور رغنے ہیں اور حرام روزی پر کوئی قدغن نہیں۔ جہاں قانون کے محافظ قانون شکنی کا ہنر سب سے زیادہ جانتے ہیں اور سماج دشمن عناصر کی بیخ کنی کرنے کے بجائے ان کی پرورش کرتے ہیں اور پھر افسانہ نگار نے "ترکیب" کے لیے "وکیل" کا انتخاب کر کے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ واقعی ہمارے وکلا "ترکیبیں" بتانے ہی کے تو پیسے لیتے ہیں۔

افسانے کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

"شیام تمھاری تو قسمت ہی بدل گئی۔"

"سب آپ کی کرپا ہے۔"

"نہیں -- بھگوان کی کرپا کہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر مجھے یہ ترکیب تو آپ ہی نے بتائی تھی --!!!"

افسانہ "کشمکش" کا عنوان بتاتا ہے کہ یہاں ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کا ذکر ہوگا، اور ہے بھی کچھ ایسا ہی۔ افسانہ نگار کی نگاہ سماج کے ایک اور پھوڑے پر پڑتی ہے اور اس کو چیرتی ہوئی نیچے تک اتر جاتی ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ نیوٹرن کی اہمیت سے شاید کسی کو انکار نہیں، لیکن "نیوز" کو شاید ہی اہمیت دی جاتی ہو۔ "ممتا" میں افسانہ نگار نے ایک فطری جذبے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ "مشورہ" میں سماج کے ایک اہم مسئلے بے روزگاری کو ابھارا گیا ہے۔

افسانہ "بند آنکھوں کا سفر" کھلی آنکھوں کے ساتھ شروع ہوا لیکن پورا افسانہ پڑھنے کے باوجود کہیں پتا نہیں چلتا کہ آنکھیں بند کب ہوئیں۔ دراصل خواب کا سہارا لے کر افسانہ نگار نے اختتام کو غیر مؤثر اور عام سا بنا کر رکھ دیا ہے۔ "اُفق کی مسکراہٹ" جاہلانہ رسوم و روایات پر ضرب کاری ہے۔ "شکریہ"، "سیلز مین"، "لبریز ساغر"، "میری کتیا" لکھ کر افسانہ نگار نے اپنی روشن خیالی اور ذہنی پختگی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ افسانہ نگار میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ سماجی مسائل کا شعور بھی ہے، اس کے بند دریچوں میں جھانکنے کی صلاحیت بھی ہے۔ انسانی زندگی میں تضاد اور دوعملی پر افسانہ نگار کی نظر بے باکانہ پڑتی ہے اور اس سمندر سے مطلب کے موتی نکال لاتی ہے۔ اب انھیں چمکانے اور تب و تاب دینے کے لیے تو محنت اور صبر لازمی ہے کیوں کہ ہر فنکار وہ نہیں ہوتا جو بہت زیادہ لکھتا ہے بلکہ وہ جو اچھا لکھتا ہے۔ عرض حال بعنوان "بات کہانی کار کی" میں افسانہ نگار لکھتا ہے:

"میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں نے برسوں جمود کی کیفیت میں گزارے ہیں۔ کئی کئی سال تک قلم نے جنبش نہیں کی اور جب قلم میں حرکت آئی تو پھر رکنے کا نام نہیں لیا۔ ایک نشست میں تین اور چار کہانیاں میں نے کئی بار لکھی ہیں۔"

اب "برسوں کا جمود" تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن "ایک نشست میں تین اور چار کہانیاں" لکھنے کا جوش اور عجلت پسندی کا اثر ان کے کئی افسانوں سے آشکارا ہے۔

اسلم جمشید پوری کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی ان کا اختصار ہے۔ وہ ایک مرکزی خیال کو کبھی دو تین صفحات میں اور کبھی آدھے اور پون صفحے میں بیان کر جاتے ہیں۔ ان کے افسانے کی ایک خوبی ان کی حقیقت نگاری ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کی فضا حقیقی ہے۔ ان کے کردار اسی دنیا میں جیتے ہیں اور زمین کے سینے سے لگ کر چلتے ہیں۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے۔

●

دو دی دروازے / منیر الدین احمد
ڈیمائی، 160 صفحات، 100 روپے
معیار پبلی کیشنز، 302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، نئی دلی-31
مبصر: وسیم بیگم

یہ جرمن شاعر وولفگانگ بیشلر کی نظموں کا ترجمہ ہے جو منیر الدین احمد نے کیا ہے۔ بیشلر ایک حقیقت پسند شاعر ہے جس نے پرانی روایتوں کو توڑا ہے اور اپنے عہد کی صورتِ حال کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران بیشلر کی عمر سترہ سال تھی۔ اس نے اس چھوٹی سی عمر میں جرمنی کی طرف سے لڑائی میں حصہ لیا۔ جب وہ جنگ سے واپس لوٹا تو اس کے جسم کے ساتھ اس کے ذہن میں بھی شکست و ریخت واقع ہو چکی تھی۔

اس مجموعے کی زیادہ تر نظمیں ہیشلر کی گذشتہ زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہیشلر نے ان نظموں میں ان حادثوں اور یادوں کو دہرایا ہے جن کو سوچ کر اس کی روح آج بھی کانپ اٹھتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات اور حقائق انسانی زندگی پر کس طرح اثرانداز ہوتے ہیں، یہ ان نظموں کا خاص موضوع ہے۔

منیرالدین احمد نے چار قسم کی نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک وہ نظمیں ہیں جن میں ہیشلر نے دوسری جنگِ عظیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی و بربادی کو پیش کیا ہے۔ ان میں شب بسری، 1951 کی راتیں، خانہ جنگی، دھرتی ابھی تک لرز رہی ہے اہم نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔ دوسری طرح کی نظمیں وہ ہیں جن میں ہیشلر نے اپنے معاشرے میں موجود برائیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ ان میں پل، لفٹ، ممانعت، قبرستان، گمشدہ بیٹا وغیرہ خاص نظمیں ہیں۔

ان کو وہ چیز بھی نصیب نہیں آئی
جوان کے ماں باپ کو ملی تھی
ایک قبر، ایک پتھر
اس پر ایک ستارہ
گھاس پات اور پھولوں کی ایک کیاری
جن کی زیارت کو اب صرف بھیڑیں آتی ہیں
(قبرستان)

تیسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جن میں عورت اور مرد کے باہمی رشتوں کا ذکر ہے۔ ان میں دو بدلیاں، قاصد کے نام، اس قدر دور، دیوی ہو دریا، چھینٹے میں قابلِ داد نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔

پھر وہ نظمیں ہیں جن میں ہیشلر قدرتی مناظر اور فطرت سے قریب نظر آتا ہے یا پھر اپنے آپ کو اس دنیا میں بالکل اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں مردے، جھیل، شاخیں، پت جھڑ، ڈپریشن اہم کہی جاسکتی ہیں۔

منیرالدین احمد نے ہیشلر کی نظموں کا بڑی ہنرمندی سے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ رواں دواں ہے۔ انھوں نے ہندی اور انگریزی کے الفاظ کا بھی بے تکلف استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ قاری کو کھٹکتے ہیں۔ چند نظموں کے عنوانات غیر شاعرانہ ہیں جیسے مسدود، اکھاڑ، مردے، رد تھ وغیرہ۔

منیرالدین احمد ان نظموں کے ترجمے میں بظاہر کامیاب تو نظر آتے ہیں لیکن قاری کوئی حتمی فیصلہ اس لیے نہیں کر سکتا کیوں کہ اس کے سامنے ہیشلر کی اصل نظمیں موجود نہیں ہیں۔ بہرحال یہ تراجم ایک اہم جرمن شاعر کی شاعری، نیز جرمن شاعری کے عصری میلانات سے اردو قاری کو متعارف کرانے میں معاون ہوں گے۔

●

صدف اردو پرائمر پارٹ I، II اور III / خوشحال زیدی
ڈیمائی، 15 صفحات، 20 روپے
نہرو چلڈرن اکادمی، C-1/47 سرائے جولینا، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
مبصر: ابرار رحمانی

زیرِ نظر تینوں پرائمرز کی جو خوبی سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ان کا دیدہ زیب، دلکش اور جاذبِ نظر ہونا ہے ایسا کہ بچے دیکھ کر ان کی طرف بے ساختہ لپکیں۔

ہر پرائمر پر تعداد اشاعت دو ہزار درج ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پڑھنے اور خریدنے والے موجود ہیں۔ لیکن مولف کی طرف سے کہیں یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ کن اسکولوں کے لیے ہیں یا کس صوبے میں داخلِ نصاب ہیں۔ ان پر یہ بھی درج نہیں کہ یہ کن کلاسوں کے بچوں کے لیے ہیں۔ تاہم یہ پرائمریں سلیقے سے مرتب کی گئی ہیں اور ان میں بچوں کی نفسیات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

پرائمر پارٹ I میں 23 اسباق ہیں جو بچے کی دعا سے شروع ہو کر 'زیراف' پر ختم ہوتے ہیں۔ اسباق کے ساتھ فوٹو اور ساتھ ہی کچھ سوالات بھی بطور مشق دیے گئے ہیں تاکہ بچے ہر سبق بہ خوبی سمجھ لیں اور ازبر کر لیں۔ لیکن دو ایک باتوں کی کمی کھٹکتی ہے ایک تو یہ کہ فوٹو دینے کا التزام ہر سبق کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ بعض جگہ فوٹو اشد ضروری ہے۔ مثلاً سبق نمبر 3 'بیوقوف آدمی' جس میں ایک بیوقوف آدمی اپنے گھوڑے پر سوار ہے اور گھاس کی گٹھری اپنے سر پر رکھے ہوئے ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ گھوڑے پر صرف اس کا بوجھ ہے، اس کے سر پر رکھی گٹھری کا نہیں۔ ایک عام ذہن کے بچے کو سمجھانے کے لیے یہاں ضروری تھا کہ اس کی تصویر دی جائے تاکہ بچہ بآسانی سمجھ سکے کہ اس گٹھری کا بوجھ بھی گھوڑے پر ہے یا نہیں؟

اسی طرح 'اتفاق میں طاقت ہے' میں کسان، کسان کے ساتوں بیٹوں اور سات پتلی پتلی لکڑیوں کی تصویر دینا بھی مفید ہوتا۔

دوسرے یہ کہ نظموں کے ساتھ شاعروں کے نام تو دیے گئے ہیں لیکن کہانیوں پر کوئی نام نہیں ہے۔

ان کمیوں کے باوجود یہ پرائمریں لائقِ توجہ ہیں۔

انوار رضوی

قالین والے کی زبان

پچھلے دو مہینے سے وہ ایک قالین بُن رہا تھا۔ کئی سو روپے اس پر لاگت آچکی تھی۔ یہ روپیہ اس نے کس طرح مہیا کیا تھا، اس کی کہانی الگ تھی۔ اس نے قرض بھیک کی طرح مانگ کر حاصل کیا تھا۔ وہ نہایت اچھا کاریگر تھا مگر زبان پر قابو نہیں تھا۔ اتنی سی بات تھی مگر رفتہ رفتہ دوست احباب ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ رشتے داروں نے منہ موڑ لیا تھا اور محلے والے اس کی شکل سے بیزار تھے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ قالین تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ وہ لالٹین کی روشنی میں قالین بنتا جاتا تھا اور بڑبڑاتا جاتا تھا— ''اے زبان تو جوتیاں نہ کھلوائیو''۔

'قالین والا' ایک مدت سے مفلسی کی زندگی گزار رہا تھا کیونکہ وہ اپنے بہترین قالین بھی بیچ نہیں پاتا تھا۔ آخر اس نے سوچا کہ ایک قالین بادشاہ سلامت کے لیے بُنا جائے۔ اسی سے دلدر دور ہوں گے۔

جوں توں کر کے لاگت جٹائی اور پچھلے دو ماہ سے وہ اسی قالین کو بُن رہا تھا۔ بہر حال آج صبح تک قالین تیار ہو جاتا تھا۔ اس دو مہینے میں اس نے کتنی ہی راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ قالین پر کئی سو کی لاگت تو آگئی تھی مگر اس کو بادشاہ سلامت سے کئی ہزار ملنے کی توقع تھی۔ اسی آس پر وہ قالین پر پوری محنت کر رہا تھا مگر ساتھ ساتھ اس کی زبان پر یہی وظیفہ تھا ''اے زبان تو جوتیاں نہ کھلوائیو''۔ اسے پچھلے کئی واقعے یاد آرہے تھے جب اپنی زبان کی وجہ سے بکا بکایا قالین واپس کر دیا گیا تھا، بلکہ اس کے منہ پر مار دیا گیا تھا۔ ایسے کئی قالین اس کی کوٹھری میں کیڑوں کا کھاجا بن رہے تھے۔ مگر اب کی بار اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ زبان کو قابو میں رکھے گا۔

مشرق کی جانب آسمان روشن ہوا اور قالین والے کا قالین بھی مکمل ہو گیا۔ اس نے کرگھے سے قالین اتارا۔ قینچی سے قالین کے فالتو دھاگے کاٹے۔ زور سے تھپ تھپا کر گرد اڑائی، قالین کو تہہ کیا اور کندھے پر ڈال کر نکل گیا۔ بیوی بچے ابھی سوئے ہوئے تھے۔ سورج ابھی بیچ آسمان میں نہیں پہنچا تھا کہ وہ بادشاہ سلامت کے محل تک پہنچ گیا۔ دربان نے اسے بادشاہ سلامت کے دربار میں پہنچا دیا۔ اس نے جب بھرے دربار میں قالین کھول کر دکھایا تو دربار دنگ رہ گئے۔ بہت شاندار قالین تھا۔ بادشاہ سلامت بھی خوش ہوئے، اور کہا ''ہمیں تم پر فخر ہے کہ ہماری ریاست میں ایسے اعلا کاریگر بھی بستے ہیں۔ تم فخرِ ریاست ہو''۔ قالین والا جھک کر کورنش بجالایا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اس نے عہد کیا ہوا تھا کہ قیمت اور انعام وصول کرنے سے پہلے ایک لفظ نہ بولے گا۔ وہ خود اپنی زبان سے ڈرتا تھا نہ جانے کیا بک دے اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دے، بادشاہ سلامت مسکرائے۔ ''اس قالین کو پہلی مرتبہ کب بچھایا جائے''۔

ایک درباری بولا ''حضور عید کے موقع پر''۔ دوسرا بولا ''سرکار کی سالگرہ پر''۔ وزیر اعظم بولے ''بندگانِ عالی شہزادے

کی تاجپوشی کا اعلان فرمانے والے ہیں۔ جشن بھی ہوگا۔ اسی موقع پر اس قالین کو پہلی مرتبہ بچھایا جائے"۔

بادشاہ سلامت خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ شہزادہ ان کی سب سے پیاری ملکہ کا بیٹا تھا۔ انھوں نے یکایک قالین والے کی جانب رخ کیا" قالین والے تم بھی تو کچھ بولو۔ یہ قالین تمہاری محنت اور کاریگری کا ثمرہ ہے۔ بتاؤ پہلی بار اسے کب بچھایا جائے"۔

اب تو قالین والے کو بولنا ہی تھا۔ وہ بول اٹھا" اس کو سرکار کے چہلم پر بچھایا جائے کیونکہ اس میں تو ملکوں ملکوں کے بادشاہ اور وزیر آئیں گے اور....."

بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ قیامت آگئی۔ ہر ایک درباری اس کو مارنے دوڑا۔ بادشاہ سلامت دہاڑے" مارو بدمعاش کو۔ نکال دو جوتے مار کر ریاست سے باہر۔ ضبط کرلو اس کا قالین"۔ مارے غصے کے ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور منہ سے کف جاری تھا۔

آن کی آن میں قالین والا لہولہان بے یارومددگار شہر کے دروازے کے باہر پڑا تھا اور اپنے دونوں کلوں پر بار بار تھپڑ لگا رہا تھا۔" وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس مردار زبان نے پھر سارا کھیل بگاڑ دیا۔ پھر جوتیاں کھلوادیں۔ ساری رات تو گڑگڑاتے بڑبڑاتے گزاری تھی اے زبان تو جوتیاں نہ کھلوائیو"۔

Principal Publication Officer
NCPUL, West Block-1,
R K Puram, New Delhi-67

چلڈرن بک ٹرسٹ کی کتابیں اردو میں

بچوں کے لیے خوبصورت سوغات

قومی اردو کونسل چلڈرن بک ٹرسٹ کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرا کے اب تک 63 ٹائٹل شائع کر چکی ہے۔ اس سلسلے کی چند کتابیں یہ ہیں : (1) مچھلیاں اڑنے لگیں- قیمت -/12 روپے (2) پتھروں کے دل- قیمت -/12 روپے (3) کچھ ہندوستانی چڑیاں- قیمت -/32 روپے (4) یاد کیجیے ہمارے رہنما (7 جلدوں میں) قیمت فی جلد -/35 روپے (5) ہاتھی اور پانی کی ٹنکیاں- قیمت -/15 روپے (6) پانی کا جہاز اور اسکی تکنیک- قیمت -/12 روپے (7) سنو کہانی- قیمت -/30 روپے

کتب فروش حضرات کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

طلبہ، اساتذہ اور اسکالروں کو خصوصی رعایت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Subscribe "Urdu Dunya" Today

زرسالانہ : 100 روپے

سالانہ خریداری فارم

میں "اردو دنیا" کا / کی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ /110 روپے کا چیک نمبر ..... بتاریخ ..... بنام National Council for Promotion of Urdu Language فسلک ہے۔ آپ "اردو دنیا" ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام .....

پتہ .....

.....

فون .....

دستخط

نوٹ : رقم بذریعہ منی آرڈر بھی ارسال کی جاسکتی ہے۔

Subscribe "Fikr-o-Tehqeeq" Today

زرسالانہ : 100 روپے

سالانہ خریداری فارم

میں "فکر و تحقیق" کا / کی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ /110 کا چیک نمبر ..... بتاریخ ..... بنام National Council for Promotion of Urdu Language فسلک ہے۔ آپ "فکر و تحقیق" ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام .....

پتہ .....

.....

فون .....

دستخط

نوٹ : رقم بذریعہ منی آرڈر بھی ارسال کی جاسکتی ہے۔

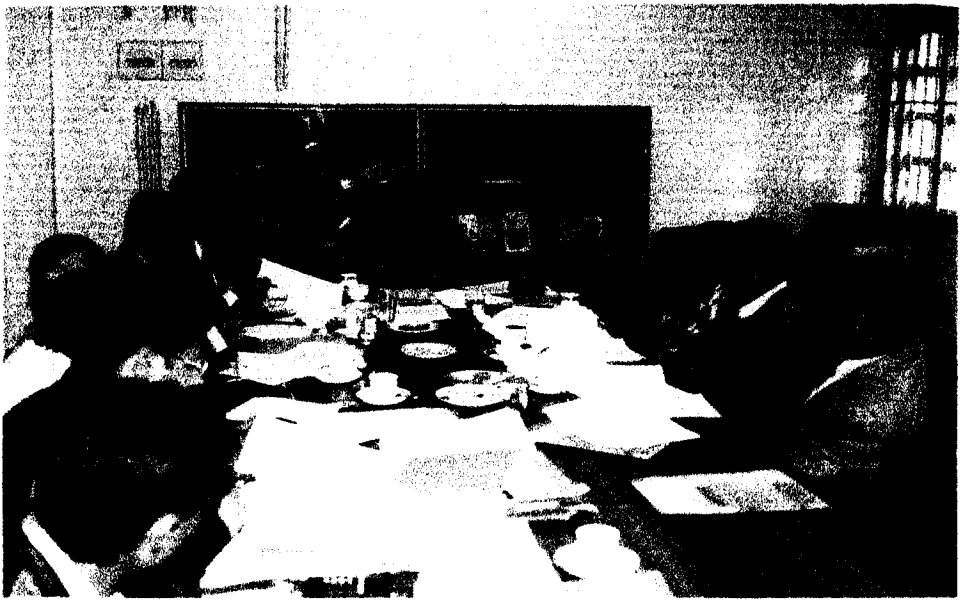

قومی اردو کونسل کی فنانس کمیٹی کا اجلاس 15/ دسمبر 2001 کو منعقد ہوا۔ تصویر میں (دائیں سے) جناب ٹی آر پرساد (ڈیسک آفیسر HRD)، جناب ایس کے ساہو (ڈیسک آفیسر IFD)، جناب اے کے قاسم (انڈر سکریٹری IFD)، پروفیسر گوپی چند نارنگ (وائس چیئرمین، قومی اردو کونسل)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور جناب کالی داس گپتا رضا (ممبر فنانس کمیٹی)۔

کمپیوٹر تعلیم کی مانیٹرنگ کمیٹی کی آٹھویں میٹنگ قومی اردو کونسل کے دفتر میں 13/ دسمبر کو منعقد ہوئی۔ تصویر میں (بائیں سے) ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈاکٹر آر۔ کے آنند (ڈائرکٹر DOE)، جناب ایم پی گوئل (پرنسپل اینالسٹ NIC)، پروفیسر مشتاق احمد پیر (ڈائرکٹر کمپیوٹر سینٹر کشمیر یونیورسٹی)، محترمہ نیلم رانی (اسٹینو)، جناب این کے اگروال (آرو) اور جناب آفتاب عالم (جامعہ ہمدرد، دہلی)

RNI No. 70323/99 DL-15052 / 2000

URDU DUNIYA Monthly, February 2001, Vol. 3, Issue: 2

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary and Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

مدرسہ جامعہ المحسن اورنگ آباد میں قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر تربیتی مرکز کا افتتاح ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل نے 31 دسمبر 2000ء کو کیا۔ تصویر میں طالبات کے ساتھ ڈاکٹر جوشی

اورنگ آباد کے مقامی [illegible] میں قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر تربیتی مرکز میں تقسیم اسناد کا جلسہ 31 دسمبر کو منعقد ہوا۔ [illegible] کی طالبات نے [illegible] پیش کیا
ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل طلبہ کے ساتھ

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 6103381, 6103938